جاوید انور کے افسانوں میں معاصر زندگی کی عکاسی: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

فریحہ اکرم

فیکلٹی آف لینگو ئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

جاوید انور کے افسانوں میں معاصر زندگی کی عکاسی: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

فریحہ اکرم

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: جاوید انور کے افسانوں میں معاصر زندگی کی عکاسی: تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: فریحہ اکرم　　رجسٹریشن نمبر: 1374/M/U/F17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر شفیق انجم: _____

نگران مقالہ

ڈاکٹر ظفر احمد _____

شریک نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی: _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان: _____

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، فریحہ اکرم حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر شفیق احمد اور ڈاکٹر ظفر احمد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

فریحہ اکرم

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرستِ ابواب	v
Abstract	viii
اظہار تشکر	ix

باب اول: موضوع کا تعارف اور سماجی ادبی زاویے

الف:	تمہید	۱
i۔	موضوع کا تعارف	۱
ii۔	بیان مسئلہ	۱
iii۔	مقاصد تحقیق	۲
iv۔	تحقیقی سوالات	۲
v۔	نظری دائرہ کار	۳
vi۔	تحقیقی طریقہ کار	۳
vii۔	مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۴
viii۔	تحدید	۴
ix۔	پس منظری مطالعہ	۴
x۔	تحقیق کی اہمیت	۵
ب:	معاصر زندگی کے سماجی و ادبی زاویے	۶
ج:	جاوید انور کا تعارف اور ادبی کوائف	۳۷
	حوالہ جات	۳۹

باب دوم: جاوید انور کے افسانوں میں سماجی زندگی کی عکاسی ۴۳

الف: جدید شہری معاشرہ اور معاشی مسائل ۴۳

i۔ اردو افسانے میں شہری معاشرت ۴۶

ii۔ جاوید انور کے افسانوں میں شہری معاشرت اور معاشی مسائل ۴۹

ب: جدید طرز زندگی کی اخلاقی جہات اور مذہبی تناظر ۶۰

ج: جدید و قدیم تصور حیات کی کشمکش ۶۸

حوالہ جات ۸۱

باب سوم: جاوید انور کے افسانوں میں سیاسی صورتحال کی عکاسی ۸۴

الف: سیاسی زندگی کے اجتماعی طبقاتی مسائل ۸۴

i۔ سیاست ۸۴

ii۔ ادب اور سیاست کا تعلق ۸۶

iii۔ جدید اردو افسانے میں سیاسی شعور ۸۹

iv۔ جاوید انور کے افسانوں میں اجتماعی طبقاتی مسائل ۹۹

ب: سیاسی زندگی کے معاصر رویے ۱۰۵

ج: سیاسی مسائل کے عام آدمی کی زندگی پر اثرات ۱۰۸

حوالہ جات ۱۱۸

باب چہارم: جاوید انور کے افسانوں میں ادبی زندگی کی عکاسی ۱۲۱

الف: ادبی زندگی سے وابستہ کردار اور کہانیاں ۱۲۳

ب: ادبی طبقے کے نفسیاتی و تخلیقی مسائل ۱۲۹

ج: ادبی طبقے کے معاشی مسائل ۱۳۳

حوالہ جات ۱۳۷

باب پنجم: مجموعی جائزہ/نتائج/سفارشات ۱۳۸

الف: مجموعی جائزہ ۱۳۸

ب: نتائج ۱۴۲

ج: سفارشات ۱۴۵

کتابیات ۱۴۶

ABSTRACT

Storytelling has always been a wonderful source of entertainment for human beings since time immemorial. From our cave dwelling forefathers to us, their modern progeny, every human soul has had some connection with stories in one way or the other. Literatures around the world are witness to man's fascination with stories of real or imaginary beings. Urdu literature is no exception. From the earliest times Urdu fiction writers have produced some wonderful stories in the form of Dastans in both poetry and prose. With the advent of 19th century focus started shifting towards Novels and short stories characters of which were not jins and fairies but real human beings. Twentieth century brought an upheaval in social, economic and political conditions of the world thus forcing Urdu writers to explore topics that address these problems. Among myriad of writers who choose to write on pressing problems of our society Javed Answer is a new yet promising name whose collection of short stories namely "Bargad" and "Siraktay Rastay" have delved deep into the modern socio-economic issues.

This thesis entitled “An analysis of contemporary life in Javed Anwar’s fiction" has been divided into five chapters. First chapter is an introduction to the subject with a look at the contemporary social and literary perspectives. This chapter includes Javed Anwar’s introduction and Literary achievements. Second chapter explores the social life as depicted by the writer in his short stories with special emphasis on urban life and problems. Depiction of political issues and their implications for common man has been discussed in third chapter while fourth one unearths depiction of literary issues in stories of Javed Anwer. Fifth and final chapter concludes the discussion with an overview and some recommendations.

اظہار تشکر

اردو میں افسانہ نگاری کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو اس حقیقت کا ادراک واضح طور پر نظر آتا ہے کہ روز اول سے ہی عصری آگہی نے اس سمت میں نمو پایا۔ افسانہ نگاروں نے ہمیشہ اپنے عہد کے بدلتے ہوئے تناظر کو اپنے افسانوں میں بیان کیا اور زندگی کے موجودہ حقائق کو عوام کے سامنے لائے۔ افسانہ زندگی کے معاشرتی و سماجی مسائل کو بیان کر کے انسانی زندگی میں اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے زندگی کے ان حقائق کو جاننے کے لیے افسانہ میری دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ اس دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے اساتذہ کی رہنمائی اور مشورے سے تحقیقی مقالے پر کام کے لیے معاصر افسانہ نگار جاوید انور کے افسانوی مجموعے ''برگد'' اور ''سرکتے راستے'' کا انتخاب کیا۔ میرے مقالے کا عنوان ''جاوید انور کے افسانوں میں معاصر زندگی کی عکاسی (تجزیاتی مطالعہ)'' ہے۔

اس مقالے کی تکمیل میں اللہ تعالی بزرگ و برتر کی نہایت شکر گزار ہوں جس کے رحم و کرم سے میں نے یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ میں شکر گزار ہوں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے صدر شعبہ ڈاکٹر عابد سیال صاحب، کوآرڈینیٹر ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور انتہائی واجب الاحترام اساتذہ کرام کی، جن کی محبت اور شفقت ہر لمحے مجھے میسر رہی۔ میں بالخصوص اپنے نگران مقالہ شفیق انجم اور ڈاکٹر ظفر احمد کی تہہ دل سے مشکور ہوں، جنہوں نے ابتداء سے اب تک ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور مجھے جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ میری مدد اور مشفقانہ رہنمائی کے لئے موجود اور میسر رہے۔ انہی کی بدولت یہ تمام مراحل آسانی سے طے پائے۔ میں اپنے والدین کی بے حد ممنون ہوں جن کی دعاؤں اور آشیر باد سے میں نے یہ مراحل طے کئے اور اس مقام تک پہنچی۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ میرے والدین کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر سلامت رکھے۔ آمین۔

میرے ساتھی سکالرز حلیم احمد، آفرینش گلناز، شاہد اقبال، عاقب جاوید اور قاضی سلطان احمد سمیت تمام احباب کی شکر گزار ہوں جن کی نیک خواہشات، مدد، راہنمائی اور حوصلہ افزائی مجھے میسر رہی۔ نیز میں اپنی ساتھی اساتذہ نسرین بیگم، عمارہ عزیز، ثونیہ شاہین اور حمیرہ ممتاز کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے ایم فل کے تمام مراحل میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا، میرے لئے قدم قدم پر آسانیاں پیدا کیں، جس کی وجہ سے کام میں آسانی میسر ہوئی۔ میں ان تمام کی علم دوستی کو دل کی گہرائیوں سے سراہتی ہوں۔ اللہ پاک سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

فریحہ اکرم

ایم۔فل اردو اسکالر

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف:۔ تمہید:

i. موضوع کا تعارف

میرے ایم فل کے مقالے کا موضوع ''جاوید انور کے افسانوں میں معاصر زندگی کی عکاسی: تجزیاتی مطالعہ'' ہے۔ جاوید انور کے دو افسانوی مجموعے ''برگد'' ۲۰۱۷ء میں اور ''سرکتے راستے'' ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئے۔ اول الذکر افسانوی مجموعے میں ۱۴ افسانے اور ۱۳ افسانچے شامل ہیں جب کہ موخر الذکر میں ۱۶ افسانے اور ۹ افسانچے شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی اپنے متنوع رنگوں میں ظہور پذیر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ جاوید انور ایک عمدہ شاعر بھی ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ''اگر تم لوٹنا چاہو'' اور ''کئی منظر ادھورے ہیں'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔

جاوید انور کے افسانوں میں ہمیں جدید زندگی اور اس سے جڑے ہوئے مسائل مختلف سطحوں پر اظہار پاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مزاج موضوعاتی اور حسیاتی سطح پر معاشرتی مسائل سے جڑا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں مختلف حوالوں سے انسانی استحصال کے نئے حربوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ معاصر زندگی کے سماجی، معاشرتی اور معاشی مسائل بیان کرنے کی بھی کاوش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں بدلتی ہوئی جدید زندگی میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کا حد سے بڑھا ہوا استعمال معاشرتی و اخلاقی اقدار میں تبدیلیوں کا سبب بنتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اقدار میں تبدیلی کا یہ عمل معاصر زندگی کو جس طرح متاثر کرتا ہے اسی کا مطالعہ میرے مقالے کا بنیادی مطمع نظر ہے۔

ii. بیان مسئلہ

جاوید انور کے افسانوں میں زندگی اپنی تمام تر رنگا رنگی اور متلون مزاجی کے ساتھ دوڑتی بھاگتی نظر آتی ہے۔ سماجی اور معاشی مسائل ان کے خاص موضوع ہیں۔ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی ضروریاتِ زندگی کے لیے بھٹکتے محنت کش طبقے کا المیہ ''آخری گجرا'' کا موضوع ہے جبکہ ''برگد'' میں طبقاتی اونچ نیچ، معاشی ناہمواریوں اور معاشرتی کشمکش کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جبر و استبداد، خوف اور استحصال کی مکروہ شکل میں افسانہ ''بھٹی'' میں ابھر

کر سامنے آتی ہیں۔افسانہ ''شیر''میں بے جاطاقت اور کاہلی کو شیر کی علامت کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔ تخیلاتی اور عملی زندگی کے تضادات کو ''دروازہ'' میں بیان کیا گیا ہے۔ دورِ جدید میں انفارمیشن ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے باعث رونما ہونے والی تبدیلیاں افسانہ ''فیک''کا موضوع بنی ہیں۔''مہربانی'' میں دیہاتی زندگی کی عکاسی معاشی اور طبقاتی کشمکش کے تناظر میں کی گئی ہے جبکہ ''نیرنگی''میں دیہاتی اور شہری زندگیوں کے تصادم سے جنم لینے والے مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ان چند مثالوں سے جاوید انور کے افسانوں کی موضوعاتی اور فکری جہت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میرے مقالے میں یہ کھوجنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جاوید انور کے دونوں افسانوی مجموعوں میں کون کون سے موضوعات معاصر زندگی کے کون کون سے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہ کاوش بھی کی گئی ہے کہ جاوید انور کے افسانوں کا اسلوبیاتی اور فکری تجزیہ کیا جائے اور اس امر کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے کہ دورِ جدید میں ہماری زندگیوں میں برپا ہونے والے انقلابات جو اپنے دامن میں سہولت اور تن آسانی کے سامانِ تعیش کے ساتھ ساتھ مسائل کے انبارِ بے پایاں بھی لیے ہوئے ہیں کیونکر ہمارے سماج کی نئی صورت گری کر رہے ہیں۔

iii. مقاصدِ تحقیق

اس تحقیق کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔جاوید انور کے افسانوں میں معاصر زندگی کی عکاسی کا تجزیہ کرنا

۲۔معاصر سماجی، سیاسی اور ادبی رویوں کے بارے میں جاوید انور کے موقف کو سمجھنا۔

۳۔جاوید انور کے افسانوں میں فنِ افسانہ نگاری کے لوازمات کی پیش کش کا جائزہ لینا۔

iv. تحقیقی سوالات

مجوزہ تحقیقی موضوع میں انور جاوید کے افسانوں میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی مطالعے کے لیے درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے گئے ہیں:

۱۔جاوید انور کے افسانوں کے موضوعات کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔جاوید انور کے افسانوں میں معاصر زندگی کی عکاسی کے کم و کیف کیا ہیں؟

۳۔جاوید انور کے افسانوں میں فن افسانہ نگاری کے لوازمات کو کس قدر توازن سے برتا گیا ہے؟

v. نظری دائرہ کار

''عصر'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی روزگار، زمانہ اور وقت کے ہیں۔ عصری آگہی کسی مخصوص عہد میں معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات، افکار، اذکار اور انکشافات کا ماحاصل ہے۔ عصری آگہی کا سب سے بڑا وسیلہ ادب ہے۔ ادب ہر دور میں اپنے معاشرے کے سیاسی، سماجی و معاشی حقائق کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ عصر حاضر کے پاکستانی معاشرے میں سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی حوالے سے جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جدید افسانہ نگاروں نے اسے ادب کا حصہ بنانے کے ساتھ ساتھ قاری کو ان مسائل سے آگہی بھی دلائی ہے۔ نیز ان مسائل کے ممکنہ حل بھی تلاش کرنے کی جستجو کی ہے۔

ساٹھ، ستر کی دہائی افسانہ نگاری کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور میں افسانہ نگاری کے تحت جو رجحانات ملتے ہیں ان میں بین الاقوامی مسائل، ۱۹۶۵ء کی جنگ، سقوط ڈھاکہ کا سانحہ، ہجرت، قومی تشخص جیسے سوالات، صنعتی ترقی اور آمرانہ نظام حکومت جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ نوے کی دہائی اور اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں اردو افسانے میں سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل، ایٹمی دھماکوں سے پیدا ہونے والی صورتحال، نائن الیون کے اثرات، اعلیٰ قدروں کی شکست وریخت، ۱۹۹۹ کا مارشل لا نیز خودکش دھماکوں کی صورت میں پیدا ہونے والی صورتحال کو موضوع بنایا گیا۔

اس تناظر میں جاوید انور نے بھی اپنے افسانوں میں کرداروں کے ذریعے معاصر سماجی و ادبی، سیاسی، معاشی صورتحال کو اپنے افسانوں میں موضوع بحث بنایا۔ آپ نے جدید معاشرے کے انسان کے مسائل کو بیان کیا؛ وہ انسان جو جدیدیت کی بھیڑ میں اپنی قدیم اخلاقی و مذہبی قدروں کو فراموش کر کے ماڈرن ازم کا شکار ہو گیا ہے۔ آپ نے اپنے افسانوں میں جدید انسان کے قیام وطعام، رسوم ورواج کو بھی بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ نیز کرداروں کے اخلاقی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی اور نفسیاتی رویوں کی نوعیت، کیفیت اور وجوہات کا تعین کر کے یہ جاننے کی سعی کی گئی ہے کہ ان میں معاصر معاشرے کی کس قدر عکاسی ہوئی ہے۔ اسی طرح ادب اور عصری آگہی کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''معاصر ادب'' میں موجود مباحث کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور ان مباحث کی روشنی میں جاوید انور کے افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے

vi. تحقیقی طریقہ کار

زیر نظر مجوزہ تحقیقی مقالے میں جاوید انور کے افسانوی مجموعوں ''برگد'' اور ''سرکتے راستے'' کو بنیادی

مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ دستاویزی تحقیقی طریقہ کار سے استفادہ کرتے ہوئے ثانوی ماخذات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جاوید انور کے کچھ تحریری انٹرویوز کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے جو اخبارات ورسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کانفرنس اور تحقیقی رسائل و جرائد کا مطالعہ بھی جدید افسانے کی روایت کو بیان کرنے کے لیے شامل تحقیق ہے۔ ان رسائل و جرائد میں ماہنامہ فنون، ماہنامہ نقش، سہ ماہی ادبیات شمارہ ۹۸،۱۰۵، تخلیقی ادب، ماہنامہ فانوس، بار یافت وغیرہ نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں تحقیق و تنقید کے میدان میں جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں: معاصر ادب از جمیل جالبی، نئی تنقید از جمیل جالبی، جدید اردو فکشن، عصری تقاضے اور بدلتے رجحان از حمیرا اشفاق، اردو افسانوں میں گاؤں کی عکاسی از خورشید عالم، جدید افسانہ نگاری کے رجحانات از سلیم آغا۔ نیز اہم اور چیدہ کتب استفادہ کی فہرست کتابیات میں مہیا کر دی گئی ہے۔

vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

مجوزہ موضوع ''جاوید انور کے افسانوں میں معاصر زندگی کی عکاسی: تجزیاتی مطالعہ'' پر ایم اے، ایم افل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر کسی بھی قسم کا کوئی تحقیق اور تنقیدی کام نہیں ہوا۔

viii. تحدید

جاوید انور نے افسانہ نگاری اور شعر گوئی ہر دو میدانوں میں قابل قدر تخلیقی کام کیا ہے لیکن میرے ایم فل کے مقالے کا دائرہ تحقیق ان کے دو افسانوی مجموعوں ''برگد'' اور ''سرکتے راستے'' کے افسانوں میں معاصر زندگی کی عکاسی تک محدود ہے۔

ix. پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر اردو افسانہ نگاری کی روایت اور تحقیقی مقالہ جات کو سامنے رکھا گیا ہے۔ افسانہ نگاری کی بنیادی کتب سے بھی استعفادہ کیا گیا ہے۔ بنیادی کتب میں ''فنِ افسانہ نگاری'' از سید وقار عظیم، ''اردو افسانہ عہد بہ عہد'' از ڈاکٹر انور سدید، ''افسانہ اور افسانے کی تنقید'' از ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات'' از ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور ''اردو افسانہ'' از ڈاکٹر شفیق انجم جیسی اہم کتب شامل ہیں۔ ان کتب کے مطالعے سے بطور صنف اردو افسانے کی بہتر تفہیم ممکن ہو پائی ہے نیز افسانے کی روایت کو سمجھنے میں بھی مدد ملی ہے۔ پاکستانی سماج کے مطالعے کے لیے بھی کتب مثلاً ''پاکستانی کلچر'' اور ''نئی تنقید'' از جمیل جالبی، ''جدید افسانہ چند صورتیں'' از صبا اکرام اور اس موضوع پر دیگر اہم کتب، مضامین اور

رپورٹس کو شامل مطالعہ کیا گیا ہے۔اس طور حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ مجوزہ موضوع تحقیق کے علمی وادبی زاویوں سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔یوں سہولت سے درست تحقیقی نتائج اخذ کرنا ممکن ہو سکے گا۔

x. تحقیق کی اہمیت

جاوید انور اردو ادب میں افسانہ نگاری کے فن میں ایک نیا اضافہ ہیں لیکن ان کا افسانہ نگاری کا فن اس قدر گہرے مشاہدے اور بر جستگی کا حامل ہے کہ وہ معمولی سے واقعے کو بھی فن پارہ بنانے کے ہنر سے آشنا ہیں۔ان کے افسانوں میں ٹھوس اور زندہ حقیقتوں کی عکاسی ملتی ہے۔اس تحقیق سے موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں پر ان کے افسانوں میں وسعت اور کشادگی کا جائزہ لیا گیا اور ان کے افسانوں میں غیر معمولی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔

ب: معاصر زندگی کے سماجی وادبی زاویے:

عصر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی روزگار، زمانہ اور وقت کے ہیں اور آگہی فارسی زبان سے ماخوذ ہے جس کا مطلب واقفیت، خبر یا علم وغیرہ کے ہیں۔انگریزی میں عصر کے لیے contemporary کا لفظ استعمال ہوا ہے اور آگہی Awareness کا متبادل ہے۔

عصری آگہی اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی حالات کا شعور رکھنے اور مسلسل وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رہنے کا نام ہے۔ہر دور میں تغیر و تبدل ہمہ وقت جاری وساری رہتا ہے۔ہر نیا عہد انسانی زندگی کو مختلف طرح متاثر کرتا ہے جوں جوں عصری سطح پر تغیر و تبدل کی کیفیت رونما ہوتی ہے تو انسانی زندگی اور اس سے متعلق تمام شعبہ ہائے زندگی بھی متاثر ہوتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''عصری آگہی سے مراد کسی مخصوص معاشرتی، تہذیبی، علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات، افکار اذکار، انکشافات سے آگہی ہے۔'' (۱)

عصری آگہی جہاں تمام افراد کو متاثر کرتی ہے وہاں ادب سے منسلک علمی وادبی شخصیات کے لیے مثل روح کی حیثیت رکھتی ہے۔عصری آگہی ادب کی سمت متعین کرنے میں مدد کرتی ہے۔ادب کو اپنے عہد سے منسلک کرنے اور زندگی کے حقائق ومعیارات کو پرکھنے اور تازہ فکری رویوں سے ہم آہنگ کرنے کا وسیلہ ہے۔عصری آگہی روایت سے انحراف کرنے کی بجائے روایت کے زندہ اور تازہ عناصر کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ادب کا تعلق کسی خاص فکر و فلسفے سے نہیں ہوتا ادب کا تعلق ہر فکر و فلسفہ سے ہے کیونکہ ہر وہ چیز جو انسان اور انسانی معاشرے سے متعلق ہوتی ہے ادب کا حصہ کہلائے گی۔عصری آگہی کا سب سے بڑا وسیلہ ادب ہے۔ادب ہر دور میں سیاسی، سماجی و معاشی حقائق کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ادب معاشرے کے تمام داخلی وخارجی پہلوؤں کو مد نظر رکھتا ہے، ان کی گہرائی میں اتر کر تمام حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ادب مشاہدات و تجربات کو اگلی نسل تک پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ادب اپنے عصر کی زبان بن کر اس کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا ہے۔اپنے زمانے اور اس کے شعور ہی سے اس کی روح بیدار ہوتی ہے۔لیکن یہ روح صرف زندگی کی یک رخی ترجمانی نہیں کرتی ہے بلکہ اس میں لاتعداد رخوں کو سمیٹ کر اسے کچھ اور بنا دیتی ہے اور اسی لیے ادب کی آواز ایک طرف

اپنے دور کی، دوسری طرف آنے والے دور کی آواز بن جاتی ہے۔ادب اور زندگی کا ہی رشتہ ہے
جو واقعات سے نہیں بلکہ روح سے قائم ہوتا ہے۔'' (۲)

عصری آگہی کا سب سے بڑا وسیلہ ادب ہے۔ادب نثر اور شعر کے ذریعے ایک نسل کے تجربات کو دوسری نسل تک پہنچانے کا وسیلہ بنتا ہے۔ادیب کی نظر معاشرے کے تمام داخلی و خارجی مسائل پر ہوتی ہے۔وہ ان پہلوؤں کو بھی سامنے لے کر آتا ہے جو تمام افراد کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ فضیل جعفری کے مطابق:

''جو لوگ عصری مسائل کو روحانی اور جمالیاتی تجربات میں بدل دینے پر قادر ہوتے ہیں ان کے
یہاں حقیقی عصریت کا عنصر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔'' (۳)

اس طرح ادیب کی عصری آگہی عام شہری کی عصری آگہی سے عمیق ہوتی ہے۔ایک عام فرد وقتی یا مادی ضرورتوں کے تحت عصر سے آگہی رکھتا ہے جبکہ ادیب کے ہاں عصری آگہی کو تاریخ کا حصہ بنا کر آنے والے وقتوں کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

کسی بھی ادب کی تشکیلِ نو میں اس عہد کے سیاسی سماجی ادبی حقائق بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے مخصوص سماجی و سیاسی حالات جدید ادب کی نشو نما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اسی طرح ساٹھ کی دہائی میں جدید پاکستانی معاشرہ سیاسی و سماجی دونوں لحاظ سے کشمکش اور الجھنوں کا زمانہ تھا کیونکہ پہلا مارشل لاء اپنی ظاہری چاشنی کھو چکا تھا۔ نئی لسانی تشکیلات کے تحت میں علامتی انداز کو اپنایا گیا،اس علامتی انداز کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں سیاسی جبر بھی نظر آیا۔اس عہد میں جدید نظم کی نئی لسانی تشکیلات کی تحریک کے ساتھ ساتھ اردو افسانے میں بھی لسانی تبدیلیاں آئیں۔ کیونکہ ۱۹۶۰ء کے بعد افسانہ فرد کی انفرادیت کا علمبردار ہے۔

نئے افسانہ نگاروں نے انسان کے باطن کی غواصی کو موضوع بنایا، باطنی حوالے سے ایسے سوالات اور الفاظ سامنے آئے جو پہلے صرف شاعری کے لیے مخصوص تھے۔اسی لیے ساٹھ کی دہائی میں افسانے کے موضوعات زیادہ تر شناخت کا بحران، تنہائی، گھٹن، اجنبیت، جھنجھلاہٹ اور دوسری ذات کی تلاش وغیرہ سامنے آتے ہیں۔۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب فسادات کا لاوا ٹھنڈا ہوا تو کچھ نئے حقائق منظر عام پر آئے، جن خوابوں کو سجا کر مسلمانوں نے اپنا علیحدہ وطن قائم کیا، وہ مفاد پرست عناصر نے خواب چکنا چور کر دیے تھے۔۱۹۵۸ء کے مارشل لاء نے جمہوریت کا وہ خواب بھی چکنا چور کر دیا تھا۔آزادی اظہار کی جو امید مسلمان لے کر آئے تھے وہ ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ان تمام حالات کا اثر ادب پر بھی پڑا۔ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں جو افسانہ لکھا گیا اس میں نئی ریاست پاکستان کے

لوگوں کا احوال تھا۔ ان حالات نے افسانے کے اسلوب میں تبدیلی پیدا کی اس دور کے حوالے سے سید علی حسنین نقوی لکھتے ہیں:

> ''پہلے مارشل لائی دور میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۱ء تک میں جنرل ایوب کی آمرانہ حکومت نے سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں ایک ظالمانہ دور کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ اردو فکشن میں علامت نگاری کا آغاز ہوا۔''(۴)

ساٹھ کی دہائی میں جب انتظار حسین نے لکھنے کا آغاز کیا تو روایتی انداز کو اپنایا۔ ان کے پہلے کے افسانوں میں ہجرت کا کرب، لاحاصلی، قنوطیت، تہذیبی الجھاؤ، بچھڑنے والوں کا درد اور فسادات کے موضوعات سامنے آتے ہیں۔ بعد میں آگے چل کر ان کے افسانوں میں جدیدیت کے حوالے سے تبدیلی سامنے آتی ہے۔

ان افسانوں میں اس عہد کے اخلاقی اور روحانی مسائل کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ جب معاشرہ گھٹن، جبر، عدم شناخت کا شکار ہو تو معاشرے کے افراد روحانی و اخلاقی مسائل میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ''آخری آدمی'' ایک مذہبی واقعہ ہے جسے واقعہ سبت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ میں ایک آدمی خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے، ہفتے کے دن مچھلی پکڑنے کی ممانعت کی جاتی ہے مگر وہ فریب کاری کر کے مچھلیاں پکڑنے کی ترکیب کا عمل درآمد کرتا ہے، جس کی وجہ سے پوری قوم عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ سب کے سب بندر بن جاتے ہیں، سب سے آخر میں بندر بننے والا شخص سب احوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے لیکن خود کو بندر بننے سے نہیں روک پاتا۔

> ''الیاسف نے کہ عقل کا پتلا تھا سمندر سے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے ملا دیا۔ سبت کے دن مچھلیاں سطح پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ سے گڑھے میں نکل گئیں۔ سبت کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں اور وہ شخص جو سب کو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا یہ دیکھ کر بولا کہ تحقیق کے جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا۔''(۵)

اس افسانے میں انتظار حسین عصری حالات سے پیدا ہونے والی صورتحال جس کے اثرات سے فرد متاثر ہوتا، ان اثرات کے باعث انسان خود کو تباہی کے دہانے پر لے آتا ہے۔

اسی طرح ''ہڈیوں کا ڈھانچہ'' اور ''ٹانگیں'' میں بھی نفس کی کشمکش اور روحانی و اخلاقی کمزوریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ پیٹ کی بھوک پر مبنی ہے جس میں ایک آدمی جو کہ مر گیا ہوتا ہے، گوشت

کے نام پر جی اٹھتا ہے اور کھانے پینے کی چیزوں پر ایسے ٹوٹ پڑتا ہے کہ شہر میں کھانے پینے کی چیزوں کی قلت پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر میں ایک عامل اس کو اپنے علم کے ذریعے مار دیتا ہے۔ اس کہانی میں انتظار حسین اپنے عہد کی بڑھتی ہوئی خود غرضی اور نفسا نفسی کو اجاگر کرتا ہے جو منفی عہد کی پیداوار ہے جس کے سبب معاشرہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ''کاش ہم جان سکتے کہ ہم اگر ہیں تو کہاں ہیں اور کاش ہمیں اپنی ذات کو بدروحوں سے نجات دلانے کے لئے اللہ کی ضرورت ہوا کرتی۔'' (۶)

اس عہد میں افراتفری خود غرضی کا راج تھا، لوگوں کے اندر عدم اعتماد، تنہائی، خود غرضی شامل ہو چکی تھی جس کے باعث وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے تھے۔ ''آدمی سالے کا کچھ پتہ نہیں۔ کیا پتا کون کیا ہے، کسی کا کوئی اعتبار نہیں نامردکانہ عورت کا۔''(۷)

اسی طرح انتظار حسین ''کایا کلپ''، ''سویاں'' اور ''سوت کے تار'' میں انسان کی نفسانیت اور خوف کو اجاگر کرتے ہیں کہ آج کا انسان ذہنی الجھن، خوف، دہشت اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔ ان کیفیات کا انسان پر ہر وقت طاری رہنا کسی المیہ سے کم نہیں۔ ''آخری آدمی'' کی کہانیوں کے ضمن میں ڈاکٹر انور احمد لکھتے ہیں:

> ''آخری آدمی، زرد کتا، ہڈیوں کا ڈھانچہ، کایا کلپ، ٹانگیں، سویاں اور شہادت کا موضوع یا تو خوف ہے گردوپیش کا، اپنے نفس کا، اپنی فطرت کا اور انہونی کا جو وسوسہ پیدا کرتا ہے، شک کو جنم دیتا ہے اور یوں مقصد حیات اور جذباتی و فکری سہاروں کو کمزور کر دیتا ہے۔''(۸)

انتظار حسین نے معاشرے کے اخلاقی زوال کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جابر حکمران طبقے نے عوام پر خوف اور دہشت جبر کے گہرے اثرات مرتب کیے، جس کی وجہ سے عصری صورت حال بدل گئی لوگوں کو براہ راست کوئی بات کہنے کا حق نہیں تھا۔ اس طرح انتظار حسین نے علامتی پرائے کو اپنایا تاکہ اپنی تخلیقات میں معاشرے کے مسائل کو اجاگر کر کے عوام کے کرب کو زبان دے سکے۔ اسی طرح انور سجاد میں بھی عصری صورتحال کو اپنے افسانوں میں بیان کرنے کے لئے علامت نگاری کا سہارا لیا۔ انور سجاد کے افسانوں کے موضوعات بھی تنہائی، خوف، دہشت، جبریت، گھٹن، ذات کا خالی پن، داخلی شکست وغیرہ شامل ہیں۔

اسی طرح انور سجاد نے اپنے افسانوں ''کارڈیک دمہ''، ''نہ مرنے والا''، ''پتھر''، ''لہو کتا'' میں انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیات اور اس عہد کا خوف، بے بسی، گھٹن، جبر، بے بسی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس ضمن میں مظہر الاسلام نے کہا:

> ''میں نے کہا، خوف تو اس عہد کا استعارہ ہے۔ اندھیرا بھری ہوئی بندوق کندھے پر اٹھا کر گھومتا

ہے۔ روشنی کالی چادر میں اپنی چیخ لپیٹے ہوئے کچہریوں کی طرف بھاگتی ہے، مگر راہ میں شہر کا بڑا تھانہ پڑتا ہے۔"(۹)

انور سجاد کا افسانہ "بچھو، غار، نقش" ایسا افسانہ ہے جس میں انہوں نے علامتوں کے ذریعے عصری آگہی، معاشرتی جبر، کشمکش کو اجاگر کیا۔ اس افسانے میں چوڑی اور ایک موری ہے جہاں سے نر اور مادہ بچھو اور ان کے بچے کمرے میں آتے ہیں۔ نر اور مادہ بچھو کے درمیان تصادم ہوتا ہے تو دونوں مر جاتے ہیں۔ ان کے بچے جوہر کے پانی میں بھیگنے کے بعد کاغذ پر نقش بناتے ہیں۔ اس افسانے میں جوہڑ اور موری کو گندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ نر اور مادہ کے تصادم کو جنسی عمل سے جوڑا جاتا ہے اور سفید کاغذ کو دنیا سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس پر سیاسی پارٹیوں نے مختلف حالات و واقعات کے نقوش بنائے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں اس افسانے کا موضوع سیاسی انتشار، معاشرتی کشمکش اور مار شلائی رد عمل بھی ہے۔ اس افسانے کا پہلا جملہ سیاسی حالات و واقعات کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ "اگر بچھو دھکتی آگ کے دائرے میں محصور ہو جائے تو وہ خود کو ڈنگ مار کے مر جاتا ہے۔"(۱۰)

ان کے افسانے "کونپل" میں عام انسان کی مجبوری اور بے کسی کو دیکھا دکھایا گیا، جو حکمران طبقے کے آگے بے کس اور مجبور ہیں، جو آمروں کے سامنے اپنی زبان نہیں کھول سکتا ہے۔ دہشت خوف ہر وقت طاری رہتا ہے۔

"پائپ والا انگارہ اس کے کھلے منہ کے راستے اس کی زبان پر رکھتا ہے۔ وہ سیاہ پوشوں کے شکنجے میں جکڑا تڑپتا ہے، چیختا ہے۔ پائپ والا اس کی زبان سے انگارہ اٹھا کر پھر رکھتا ہے، حتی کہ منہ کے لعاب سے انگارہ بجھ جاتا ہے۔ پائپ والا کلپ سمیت انگارہ پرے پھینک کر بڑے اطمینان سے اٹھتا ہے سوچتا ہے اب یہ سدا کے لیے گونگا ہو گیا ہے۔"(۱۱)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمران آمروں کے آگے عوامی طبقہ، ظلم و تشدد اور بربریت کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے زبان پر تالے لگا لیتا ہے۔ جو کوئی زبان کھولنے کی کوشش کرے اس کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دی جاتی ہے۔ یہی خوف اور جبر کی کیفیات ان کے افسانے "آنکھ" اور "سایہ" میں بھی موجود ہے۔ انسان اس خوف اور جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر قوت گویائی سے محروم ہو چکا ہے۔

"ہم قیدی نہیں ہیں، صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر یاد آتا ہے کہ ہم قید میں ہیں۔ ہمارے ہونٹوں پر خاموشی کی مہریں ہیں۔ ہماری چپ سازش ہے اور ہم سوچتے رہتے ہیں کہ یہ لہر کب مکمل ہو گی۔"(۱۲)

انور سجاد کے افسانوں میں عصری شعور کے حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم رقمطراز ہیں:

''انور سجاد کے افسانوں میں جبر، خوف، اجنبیت، تنہائی بنیادی استعارے ہیں۔ یہ استعارے کبھی فرد کے حوالے سے کبھی سماج اور کبھی حیات و کائنات کے مجموعی تسلسل کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ جدید انسان اور جدید زندگی نے تشکیک اور عدم تحفظ کی جو فضا پیدا کیے انور سجاد نے اپنے افسانوں میں اس کے احساساتی پہلوؤں کو نمایاں کیا۔''(۱۳)

انور سجاد نے اپنے مجموعے ''آج'' میں مختلف امراض دمہ، مرگی، کینسر وغیرہ کو بطور استعارہ استعمال کر کے آج کے معاشرے کی طبقاتی خلش، کشمکش ا، خلاقی قدروں کے زوال کو بیان کیا۔

خالدہ حسین کے افسانوں میں ان کے کردار خوف اور دہشت میں مبتلا ہو کر عدم تحفظ، عدم شناخت شکار ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی بے معنویت کا نوحہ ان کے کرداروں کو ہمہ وقت گھیرے رکھتا ہے۔ خالدہ حسین نے عورت کی مظلومیت، بے بسی اور لاچاری کو بھی اپنے افسانوں میں دکھایا ہے۔ وہ عورت کی شناخت اور پہچان کے حوالے سے حساس دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ہاں عورت عدم تحفظ، عدم شناخت کے بحران اور نفرت اور غصے کے روپ میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت اپنی شناخت اور پہچان بنانے میں سر گرداں نظر آتی ہے کہ میں کون ہوں اور میری کیا حیثیت ہے۔ عورت کی مکمل شناخت کروانا چاہتی ہیں تاکہ عورت مرد کے ساتھ جڑ کر اپنی پہچان بنالے۔

''میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں بتایا کہ تم اس دنیا کے ساتھ میرا ناتا ہو ورنہ میں توریزہ ریزہ اڑتی پھروں، جس طرح زمین کی کشش ختم ہو جائے یا جسم کا وزن مر جائے تو میرے وجود کا وزن ہے۔ صرف اس لئے میں تمہارے ساتھ سفر کر رہی ہوں۔''(۱۴)

اسی طرح خالدہ حسین نے مردوں کے عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک کو بھی بیان کیا کہ ایک مرد اپنی بیوی کے ساتھ کس حد تک بے حسی سے پیش آتا ہے۔ اس میں ان کا افسانہ ''دھند'' اہم ہے جس میں شادی شدہ جوڑا اجو کئی سالوں سے ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں ہیں۔ اس افسانے میں شوہر بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے جاتا ہے لیکن اس کو حلیہ یاد نہیں آرہا ہوتا ہے۔ پولیس اسٹیشن جا کر بیوی کا حُلیہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ اس سے مرد کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

''میں نے پھر یاد کرنا چاہا کیا پہن رکھا تھا اس نے، کس طرح کا لباس، کونسا رنگ، لباس تو لباس مجھے اس کا جسم بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ محض ایک اسم تھی کام نمٹانے والی، کوئی پراسرار مشین اگر ایسا نہ ہوتا تو ضرور مجھے اس کی تفصیلات یاد رہ جاتیں۔''(۱۵)

خالدہ اس افسانے میں مرد کی منافقت بھرے اور اجنبی رویے کی عکاسی کرتی ہے اور ان کے ہاں افسانوں میں عورت کو اس کا اصل مقام دلانے اور اس کی شناخت کو تسلیم کروانے کی سعی موجود ہے۔ان کے موضوعات عام زندگی سے لیے گئے ہیں۔ ان کے افسانے اسی زندگی کی سچائیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ غرض خالدہ حسین کے افسانے خارجی اور باطنی حقائق میں ڈھل کر عصری حالات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہاں عصری حقائق نا صرف گزرے وقت کی روداد بیان کرتے ہیں بلکہ مستقبل کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتے ہیں۔

اردو افسانہ ستر کی دہائی میں عصری آگہی کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔اس دور کے افسانے نے بین الاقوامی مسائل،۱۹۶۵ء کی جنگ، سقوط ڈھاکا، ہجرت، صنعتی ترقی، عوامی مسائل، آمرانہ حکمرانوں کے خلاف بغاوت جیسے موضوعات کو بیان کیا گیا۔اس دہائی میں جو افسانہ نگار منظر عام پر آئے ان میں رشید امجد، مسعود اشعر ،اعجاز راہی، انتظار حسین، مرزا حامد بیگ، نشاط فاطمہ ،زاہدہ حنا، رخسانہ شوکت ،خالدہ حسین، انور سجاد وغیرہ شامل ہیں۔

یہ وہ دور تھا جس میں انداز بیان کے لئے سبھی اسالیب، استعارہ، تشبیہ، علامات و تجرید کو اپنایا گیا۔اس عہد کی عصری سچائیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنانے کے لیے اس عہد کے افسانہ نگاروں نے علامت اور تجرید کے پردے
میں حالات و مسائل کی عکاسی کی۔اس دور میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کی وجہ سے پاکستانی اردو افسانے میں حب الوطنی کے جذبات کا رجحان سامنے آیا جو ایک ہنگامی صورتحال تھی۔ لیکن اس صورتحال نے افسانہ نگاروں کو ذہنی طور پر بہت متاثر کیا۔ ہمارے افسانہ نگاروں میں غلام مصطفی علی نقوی نے جنگ کا اثر قبول کیا۔ ''نغمہ اور جنگ''، ''جلی مٹی کی خوشبو''اور ''سبز پوش'' جیسے عمدہ افسانے لکھے۔ ''سبز پوش''افسانے میں جذباتیت سے کام لے کر مسلمان سپاہیوں کی بہادری کی بہت تعریف کی گئی۔ ''اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھ لی تھی۔ وہ خود سبز پوش تھا اور اس کی پیشانی سے نور پھوٹ رہا تھا۔''(۱۶)

اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ پاکستانی سپاہیوں کا بہادری سے اپنے ملک کی خاطر لڑنے کا جوش و خروش اس حد تک بڑھ گیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی طاقت یا سبز پوش بزرگ ان کی مدد کے لیے آن پہنچے ہیں۔ان کے ہاں سبز پوش پاکستانی سپاہیوں کی حب الوطنی ہے۔

خدیجہ مستور کا افسانہ ''ٹھنڈا میٹھا پانی'' بھی ۱۹۶۵ء کی جنگ کے ضمن میں لکھا گیا افسانہ ہے۔اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک رات اچانک بھارت پاکستان پر حملہ آور ہو کر ملتان کی بستی قاسم بیلا پر بمباری شروع کر دیتا ہے۔ مرکزی کردار، جو ملتان سے تعلق رکھتا ہے، اپنی بیوی بچوں کی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوتا

ہے۔لیکن ان کے اندر جنگ کا خوف اور ڈر جگہ پا جاتا ہے، جب بھی کسی گولے بارود کی آواز سنتی ہے تو اس کا دل کانپ اٹھتا ہے۔اس کو ۷ اروز جنگ کے یاد آجاتے ہیں۔

"مجھے امن سے محبت ہے مجھے جنگ سے نفرت ہے مگر مجھے اس جنگ سے بھی امن کی طرح محبت ہے جو انسان اپنی زندگی اپنی عزت اور ملک کی بقا کے لیے لڑتا ہے۔ہاں تو کہہ رہی تھی کہ جنگ ختم ہو گئی ہے مگر میں جب تک زندہ ہوں میری یادیں ختم نہ ہوں گیں۔"(۱۷)

اسی طرح ان کے افسانے "راستہ" میں سرحد پر بسنے والے لوگوں کے انسانی جذبات کو ابھارنے کی سعی کی گئی کہ انسانی جذبات ملک کی سلامتی و بقاء میں جوش و خروش کی انتہا کو چھو جاتے ہیں۔"اس نے عہد کر لیا تھا کہ اگر اس کے ملک پر ذرا سی بھی آنچ آئی تو وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادے گا مگر اس مسحور کن فضا میں زہر نہ گھلنے دے گا۔"(۱۸)

اس افسانے میں لوگوں کے جذبات کی عکاسی کی گئی کہ لوگوں کے جذبات اور احساسات اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہیں اور بقا کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔وطن کی خاطر ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

مسعود مفتی نے بھی ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں قلم اٹھایا۔آپ کا افسانوی مجموعہ "رنگ سنگ" میں لکھے گئے افسانے سپاہی، نیا آدمی، دو خون، اپنے وغیرہ اسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ان کے افسانے "سپاہی" میں مرکزی کردار نعیم، جو سپاہی تھا، انیس سو پینسٹھ کی جنگ لڑتا ہے، آنکھوں دیکھا حال اپنے دوست کو سناتا ہے۔

"وہ ایک قیامت کا سماں تھا۔ گرد دھواں گرد گھن گرج ہمارے اندر جوش، غصہ، ہیجان، فرد کی ہستی، عجیب طوفانی بھنور میں کہیں غائب ہو چکی تھی اور ہم سے ہر ایک اس وسیع منظر کا حصہ بن چکا تھا۔"(۱۹)

"فرخندہ لودھی" کا افسانہ "پریتی" بھی جنگ کی روداد پر مشتمل ہے، جس میں جنگ کے دوران ایک عورت "پریتی" اپنی جان بچا کر پاکستان آجاتی ہے۔ یہاں وہ ایک کرنل سے شادی کرتی ہے اور جب کرنل کو اس کے بھارتی ہونے اور شادی شدہ ہونے کا علم ہوتا ہے تو وہ اس کو باحفاظت ہندوستان کی سرحد تک چھوڑ آتا ہے۔اس افسانے میں عورت کا تقدس پاکستانی سپاہیوں کی نظر میں دکھانے کی سعی کی گئی۔

اس طرح انیس سو پینسٹھ کے ضمن میں جو افسانے تحریر ہوئے وہ جذبہ حب الوطنی کے تحت اور جذباتی جوش و خروش میں لکھے گئے۔ان افسانوں نے اپنے عہد کی عصری صورتحال کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کی۔اس

دور میں لکھنے والے جذباتی انداز میں فوج اور عوام کا مورال بلند کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔اس کے بعد فسادات کی تحریکوں اور سقوط ڈھاکہ کی وجوہات کے عوامل کو اردو افسانہ نگاروں نے موضوع بنایا۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل حالات وواقعات کا بھی جائزہ لیا جو ۱۹۷۱ء کی جنگ کا سبب بنے۔

سقوط ڈھاکہ سے قبل کے واقعات کے ضمن میں مسعود مفتی نے ایک افسانہ ''باغی'' لکھا۔اس افسانے میں ان حالات کی عکاسی ملتی ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سبب بنے۔۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو بنگالیوں نے ''یوم پاکستان'' کی بجائے ''یوم مذمت'' منایا ہر جگہ بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا گیا جلسے جلوس نکالے۔

> ''پھر خراماں خراماں سیڑیاں منڈیر کود کر چھتوں پر بنگلہ دیش کے جھنڈے لگا رہا ہوتا بلکہ بعض لوگوں نے تو مکان کے ہر کونے پر منڈیر اور برچی پر علیحدہ جھنڈا لگایا۔ہر طرف سے نظر آئے۔''(۲۰)

اسی طرح شہزاد منظر کا افسانہ ''یوٹوپیا'' سقوط ڈھاکہ سے قبل کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔اس میں سقوط ڈھاکہ سے قبل انتشار فسادات اور اس ضمن میں چلائی جانے والی تحریکوں کا احوال بیان کیا گیا ہے جو سقوط ڈھاکہ کے واقعات کا سبب بنی۔''عوامی بیداری اور طلبہ کی تحریکوں نے پورے صوبے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور اس بے چینی اور انتشار نے عام بغاوت کی صورت اختیار کر لی تھی۔''(۲۱)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے آئے دن جلسے، جلوس اور عوامی تحریکوں نے حالات کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ لوگوں نے پاکستان سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا کہ غیر بنگالی کو مشرقی پاکستان میں رہنا دشوار ہو گیا۔

اس ضمن میں انتظار حسین کا افسانہ ''اندھی گلی'' بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے دلوں میں نفرت و حقارت کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ تہذیب و ثقافت اور لسانی جھگڑوں نے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت کے جذبات پیدا کر دیے۔

> ''مسلمان ہونے کے باوجود ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ بہت تھا۔زبان کا فاصلہ، تہذیب کا فاصلہ ہم نے اس فاصلے کو پاٹنے اور جاننے کی کوشش نہیں کی۔ نہ انہوں نے ہمیں جانا نہ، ہم نے انہیں پہچانا۔''(۲۲)

لسانی مسائل کے حوالے سے ام عمارہ کا افسانہ ''بے گناہی'' بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔اس افسانے میں بتایا گیا کہ بنگلہ اور غیر بنگلہ لوگوں میں یہ احساس بیدار ہونے لگا کہ وہ لسانی اور تہذیبی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔اس لیے وہ اس معاشرے کا حصہ نہیں بن سکتے ہیں، نہ زمین ان کو قبول کرے گی۔اس فرق کے ساتھ

زندگی بسر کرنا دشوار عمل ہے ان لوگوں کی پہچان بدیشی ہی رہ جائے گی۔

''پھر کیا ہوا بابا جب ہمیں یہیں رہنا اور اس مٹی میں مل جانا ہے تو پھر ہماری جڑیں اسی طرح یہاں مضبوط ہو سکتی ہیں۔ بڑے بھیا نے بابا کی بات کاٹی۔ تم کہہ سکتے ہو بیٹے، ورنہ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس مٹی کا پیوند بن جانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا اور پیوند پیوند ہی رہے گا۔''(۲۳)

اسی طرح غلام محمد کے افسانے ''ترک وفا''، ''تین مسافر'' اور ''اداسی'' لسانی اور تہذیبی اختلاف کے حوالے سے بہت اہم ہے آپ نے اپنے افسانوں میں تہذیب و کلچر کے نئے پہلوؤں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے ہجرت کر کے بنگال آئے ہوئے لوگوں کا المیہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے اداسی سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''اینگلو انڈین وغیرہ بھی خود کو ہندوستانیوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب تصور کرتے تھے۔ پر دیکھتے نہیں کہ آج کیا عالم ہے، نہ انگریز انہیں اپنا کہتے ہیں نہ ہندوستانی۔ آپ لوگ بھی یوں ہی رہ جایئے گا۔ کچھ دنوں بعد نا یوپی آپ کو تسلیم کرے گا نہ مشرقی بنگال۔''(۲۴)

اسی طرح اختر جمال نے اپنے افسانے ''دوسری ہجرت'' میں اردو اور بنگالی زبان کے لسانی اختلاف کو ان الفاظ میں بیان کیا۔

''جگہ جگہ اردو اور بنگالی کی لڑائی اس طرح شروع ہو گی جیسے کسی زمانے میں اردو اور ہندی کی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ اردو اور ہندی بھی ایک ماں کی دو بیٹیاں تھیں مگر انگریز بہادر نے اپنی حکمت عملی سے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا۔ اب ان کے جانشین بنگلہ اور اردو کی لڑائی کا خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔''(۲۵)

اسی طرح لسانی و تہذیبی حوالے سے لکھے گئے افسانوں میں فسادات، قتل و غارت، وحشت و بربریت کے واقعات کو دکھایا گیا۔ ان حالات کے پیش نظر ۱۹۷۱ء کے آخری مہینوں میں ہر طرف افراتفری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا، جس سے جنگ کے حالات پیدا ہوئے۔ اردو ادب نے ان تمام حالات و واقعات کو اپنے اندر سمونے کی سعی کی ہے۔ اردو کے ادیبوں نے جنگ کے حالات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تمام مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اسی طرح افسانہ نگار مسعود اشعر نے اپنے افسانے ''اپنی اپنی سچائیاں'' میں فوجی کارروائی کے دوران فوجیوں کے ناروا سلوک ظلم و زیادتی کو بیان کیا۔

''ہم سب دیکھ لیں گے انہوں نے ایک قہقہہ لگایا تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں سامنے سے ہٹ جانے کا مطلب نہیں سمجھتی تھی مگر جب وہ میری بیٹی کی طرف بڑھے تو میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور آگے بڑھی یہ تو میری بیٹی ہے یہ تمہاری بیٹی ہے یہ تو مرد نہیں ہے۔''(۲۶)

اسی طرح ۱۹۷۱ء کی جنگ کے حوالے سے مسعود مفتی کا افسانہ ''نیند'' ایک لازوال اہمیت کا حامل ہے۔ اس افسانے میں جنگ کو ایک سوچی سمجھی سازش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

''انہوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں گولیاں چلا کر انہیں قتل کرنا شروع کیا تاکہ ان کے خاندانوں میں بے چینی بڑھے اور وہ حکومت پاکستان پر زور ڈالیں کہ وہ ہندوستان کی شرائط مان کر جنگی قیدیوں کو رہا کروائے۔''(۲۷)

۱۹۷۱ء کے بعد مشرقی پاکستان کی ساری فضا ایسی ہو گئی کہ جس میں انسان خوف اور وہم کا شکار ہو کر ذہنی الجھن کا شکار رہتا ہے کہ کس وقت میں دھوکا ہو جائے۔ عدم اعتماد کی فضا ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اسی طرح ابراہیم جلیس نے اپنے افسانے ''بانگلادیش'' میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کی صورتحال کو بیان کیا۔ آزادی کی خاطر علیحدہ وطن حاصل کرنے والوں کو ان کی من پسند آزادی نہ دی گئی۔ لوگ مصائب و مصیبت سے دوچار نظر آرہے تھے۔ لوگوں میں غلطی کا احساس علیحدگی کے فوراً بعد ہوا۔ ''میرا بنگلہ دیش ابھی کہاں بنا ہے۔ پتہ نہیں ہم غریبوں کا بنگلہ دیش کب بنے گا، ابھی تو بڑا بنگلہ والا بنگالیوں کا بنگلہ دیش بنا ہے۔''(۲۸)

۱۹۷۱ء کی جنگ پر انتظار حسین کے افسانے ''سید'' اور ''اسیر'' میں ۱۹۷۱ء کے بعد کی بے چینی، مایوسی اور انتشار کا احساس ملتا ہے۔ ان افسانوں میں سقوط ڈھاکہ کے اسباب، سازش نے کہاں سے جنم لیا؟، اصل مجرم کون ہے؟ ان تمام سوالات نے عوام کے ذہن کو انتشار اور مشترکہ کر دیا تھا۔ ان تمام سوالات کو ان افسانوں میں اٹھایا گیا۔

''انور نے کسی قدر گرمی سے کہا! وہاں تو زیادہ تر باہر ہی سے ہوا البتہ یہاں اندر سے زیادہ ہوا اس لئے جنگ کے بعد زیادہ ہوا۔

کیا ہوا؟

ہڑتالیں، تالہ بندی، جلسے جلوس، مار دھاڑ، طلبہ کے ہنگامے، گرفتاریاں۔''(۲۹)

۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان رابطے منقطع ہو گئے۔ اردو خط و کتابت پر پابندی لگا دی گئی، اس طرح ہندوستان میں مقیم لوگوں کی دکھی داستان اور ختم نبوت پر عوامی طرز بیان کا احساس انتظار حسین نے اپنے افسانے ''ہندوستان سے ایک خط'' میں کیا:

''اب ہم ایک آفت زدہ خاندان ہیں جو اپنا ٹھکانہ اور شجرہ گم کر چکا ہے اور انتشار کا شکار ہے۔ کوئی ہندوستان میں کھیت ہوا، کوئی بنگلہ دیش میں گم ہوا اور کوئی پاکستان میں در بدر پھرتا ہے، عقیدے میں خلل پڑ چکا ہے۔''(۳۰)

بیسویں صدی کے نصف آخر میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسان کی سوچ کو بدل کر رکھ دیا۔ نئی نئی ایجادات نے انسان کے درمیان فاصلوں کو سمیٹ دیا۔ دنیا نے گلوبل ویلیج یعنی عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر لی۔ جدید اسلحے کی مانگ، دہشتگردی، حکومتوں کا عدم استحکام، مہنگائی، عوام کا احتجاج، دیگر زندگی کی ضروریات و کشمکش نے معاشرے کے ہر فرد کو متاثر کیا۔ الطاف فاطمہ نے اپنے افسانے ''جشنے دار'' میں دو طبقوں کے طرز زندگی کو موضوع بنایا۔ ایک طبقہ جو غربت کی لکیر سے نیچے حیوان نما انسانوں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے، دوسری طرف ایسا طبقہ جو زندگی کی تمام ضروریات پوری ہونے کے ساتھ ساتھ تمام آسائشوں سے بھی مستفید ہو رہا ہے۔ نیا گوتم، ذہن کا اقلیدسی زاویہ، خستہ خاتم اور جب دیواریں گریہ کرتی ہیں یہ افسانے شہروں میں امن و امان کی صورتحال اور تشدد آمیز زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ''پہلے لوگ چل کر میدان شہادت کو جاتے تھے اور اب شہادت خود چل کر بستیوں اور سڑکوں گلیوں اور بازاروں میں آتی ہے۔''(۳۱)

اسی طرح عالمگیریت، جدید صنعتی معاشرے کی مرہون منت ہے۔ پاکستان اور پاکستان کی سرحدوں کے پار سیاسی اتار چڑھاؤ، سفارتکاری، بیوروکریسی کے مسائل تقریباً یکساں ہیں۔ صنعتی طبقے کے مسائل حقوق نسواں کے لیے کوششیں، وومینز ایکشن فرنٹ کا قیام وغیرہ عالمگیریت کا خاصہ ہیں۔ ہر طرف ایک سا ہجوم، اس ہجوم کے نفسیاتی اور معاشی مسائل بھی ایک طرح کے ہیں، تو اس عالمگیریت اثاثے یکسانیت کو الطاف فاطمہ نے اپنے افسانے ''ذہن کا اقلیتی زاویہ'' میں بہت عمدہ انداز میں بیان کیا۔

پاکستانی عوام کو دو جنگوں کا سامنا تھا ۱۹۶۵ء کی جنگ جس میں عوام نے کافی جذبے سے لڑائی کی اور ۱۹۷۱ء کی جنگ جس میں قنوطیت، افسردگی، بیچارگی کے احساسات نمایاں ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے المیہ نے انسان کو نفسیاتی کیفیات سے دوچار کیا تو دوسری طرف عالمی دنیا پر بھی اکتاہٹ، افسردگی، مایوسی، تنہائی کا دور دورہ تھا۔

وجودی فلسفے کے علمبردار سورین کرکیگارڈ نے کہا: ''عدم تک انسان کی رسائی حزن کے ذریعے ہوتی ہے۔''(۳۲)

وجودی فلسفی بالعموم بیسویں صدی کے حالات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کا وجود جوہر پر مقدم ہے۔ قاضی جاوید لکھتے ہیں

''وجودیت ہمارے عہد کا فکری مرقع ہے۔ اس عہد کی مخصوص بے چینی، کشیدگی، تشویش اور

کھچاؤ جو ہولناک جنگ و تباہ کن ہتھیاروں، شدید سماجی انقلاب و اختیار پسند گروہ پرست اور فرد دشمن عقیدوں اور روحانیت کے زوال کا نتیجہ ہیں، کا اظہار وجودیت میں ہوا۔"(۳۳)

اردو افسانے میں اس رجحان کی ایک علمبردار خالدہ حسین ہیں۔ان کے افسانوں کا کرب اور حساسیت شدت سے ان کا تعلق وجودی فلسفے سے جوڑ دیتی ہے۔ان کے افسانے "سواری" میں شہر غیر محفوظ ہے۔لوگوں کے ہجوم کے باوجود تنہائی اور اجنبیت کا راج ہے۔لوگ اعصابی تھکن اور تناؤ میں مبتلا ہیں، شہر کی گلیوں کی دہشت انگیز فضا پورے شہر میں پھیل جاتی ہے۔جدید عہد کے بہت سے افسانہ نگاروں نے موت اور سماج پر قلم اٹھایا کیونکہ یہ جدید مشین کا دور بن چکا ہے، طبقاتی فرق سر اٹھانے لگے، سائنس کی ترقی نے سہولیات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ مادی ضروریات و آسائشات کے خواب تو دکھا دیے لیکن انسان کی ان تک رسائی ناممکن ہوتی گئی۔جس نے انسان کے رویے میں قنوطیت، عدم اعتمادی، اجنبیت، افسردگی، مایوسی نے انسانی ذہن پر گہرے اثرات ڈالے۔وارث علوی کہتے ہیں۔"آدمی کے پاس جب تک ذہن ہے وہ اثرات قبول کرتا رہے گا اور مختلف کیفیات کی آماجگاہ رہے گا۔ذہن انسانی زندگی پر غور کرتا ہے اور اداس ہو جاتا ہے۔"(۳۴)

ستر کی دہائی میں اردو افسانے میں علامت اور تجریدیت کا رجحان ساز عہد وقوع پذیر ہوا کیونکہ اس وقت کے سیاسی حالات کا تقاضہ تھا کہ بات کھل کر نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ پاکستان میں آمرانہ نظام کا قیام، مذہبی اور ریاستی جبر، آزادی اظہار پر پابندی، تشدد آمیز واقعات نے معاشرے کے ہر فرد کو خوفزدہ کر دیا۔اس طرح علامتی اور تجریدی اظہار اس دور کی عکاسی کے لئے ضروری اور موزوں طریقہ اظہار سمجھا جانے لگا۔اردو میں علامت نگاری کے اہم نمائندوں میں انتظار حسین، انور سجاد، رشید امجد، مظہر الاسلام، مرزا حامد بیگ کے نام شامل ہیں۔انور سجاد اپنے ایک ڈرامے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں: "میں نے اپنی بات اس انداز سے کہہ دی اور اگر صاف صاف کہتا تو اس کا تاثر مجروح ہوتا اور وہ ڈرامہ بین ہو جاتا۔"(۳۵)

۱۹۶۰ء کے بعد افسانہ نگاروں نے خوف اور دہشت کی فضا کو اپنے افسانوں میں دکھایا۔کبھی انسان ریاستی جبر کا شکار، کبھی سائنس و ٹیکنالوجی کی یلغار، کبھی مذہبی انتہا پسندی، کبھی مادیت پرستی کے سرمایہ دارانہ نظام نے انسان کو خوف میں مبتلا کیا۔خالدہ حسین کا "سواری" افسانہ اسی دہشت زدہ فضا کی عکاسی کرتا ہے۔انور سجاد کا افسانہ "عین وسط میں سہرا تھا" بھی ایسے شہر کی تصویر پیش کرتا ہے جو خوف و ہراس میں ڈوبا ہوا ہے۔اسی طرح رشید امجد کے افسانے "لا=؟"، "تماشا عکس تماشا"، "ایک گمنام سیاح کی ڈائری کے چند اوراق"، "بے خوشبو عکس" اور "الجھاؤ" میں اسی جبر اور خوف کی فضا ملتی ہے۔اس خوف جبر اور دہشت نے عصری انسانوں میں عدم شناخت کا مسئلہ پیدا کیا فرد اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔انسان کے ہاتھوں ذلت اٹھا رہا ہے خود پرست مادہ پرست لالچی اور استحصالی

مغربی ملٹی نیشنلز، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے دیگر تنظیموں کا معاشی جبر اور حکومت ملٹی نیشنل جنہوں نے گلوبل ویلیج بنایا۔ اس عالمی گاؤں کے تحت میڈیا، انفارمیشن ٹیکنالوجی کی یلغار، معاشی غلامی، عالمی منڈی، دہشتگردی، تشدد، ایٹم بم، بیماریوں، معاشی و اقتصادی بحران نے عصری انسان کو حقیر بنادیا۔

رشید امجد کے بے شمار افسانوں میں شناخت کی گمشدگی کے کرب کو موضوع بنایا۔ ان کے افسانے ''ریت پر گرفت'' وقت کا اوجھل ہوتا احساس، چیزوں کو دھندلکوں میں گم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ہر چیز اپنا وجود کھوتی نظر آتی ہے۔ انسان کا آپس کا تعلق مشینی زندگی کی نذر ہو چکا ہے۔ افسانہ ''بیزار آدمی کے بیٹے'' کے کردار الف ب ج، اپنی شناخت کے مسئلے میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ یہ سب قاتل ہیں۔ ہر ایک کی جیب میں چھرا ہے۔ اخلاق دیانتداری حب الوطنی جیسے تمام الفاظ کھو چکے ہیں جدید معاشرتی زندگی نے عصری انسان سے دوستی اور رشتے تعلق وغیرہ چھین کر کاروباری تعلق کو جگہ دے دی ہے۔ ''آج کل اسے بار بار احساس ہو رہا تھا وہ ایک مشین کی طرح ہے جس کا کنٹرول سوئچ صبح ۹ بجے سے شام ۴ بجے تک دفتر کی عمارت میں ہوتا۔''(۳۶)

شناخت آدم، پہچان انتظار حسین کا بھی موضوع ہے۔ انہوں نے جدید عہد کی خستہ حالی، ابتری، بدحالی، بگاڑ کو قدیم داستانوی انداز میں بیان کیا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان انتظار حسین کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ان کی کہانیوں میں اپنے عہد کا آشوب، اقتدار کا زوال، تہذیبی اکھاڑ پچھاڑ پوری شدت سے نمایاں ہے۔''(۳۷)

اسی طرح ان کے افسانے ''وہ جو کھوئے گئے'' میں اجتماعی عدم شناخت کا مظہر ہے۔ یہ کہانی چار افراد کے گرد گھومتی ہے جو شک و سوسے وہم اور خوف کا شکار ہیں۔ شک اور تذبذب کا عکس شکوک لوگ، افسانے میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اور میں، خیمے سے دور، سفر منزل شب، اور نرناری میں بھی ان لوگوں کی حالت زار کو بیان کیا گیا جو عدم شناخت کا شکار ہیں۔

ستر کی دہائی کے آخر پر آکر ہمیں ۶۵ کی جنگ، ۱۹۷۱ کی جنگ اور سقوط ڈھاکہ جیسی عصری صورتحال سے مکمل آگہی ملتی ہے۔ ۸۰ کی دہائی کا افسانہ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی حقائق کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اس دہائی کے شروع میں فرد نے اپنے باطن کو اہمیت دی، اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ افسانہ نگار جس شناخت کو برقرار رکھنے کے لیے گامزن تھا، وہ شناخت اس دہائی میں انفرادی سے اجتماعی صورتحال اختیار کر گیا۔ ۱۹۷۷ء میں مارشل لا نافذ ہوا تو قومی سطح پر سیاہ باب رقم ہوا جس کی زد میں پوری قوم آگئی۔ بقول رشید امجد

> ''۱۹۷۷ کے مارشل لا نے ملک کو پھر اندھیری راہ پر دھکیل دیا۔ اس مارشل لا کا کوئی قانونی، اخلاقی اور آئینی جواز نہ تھا۔ آئین موجود تھا۔ پی این اے اور حکومت کے درمیان سمجھوتا طے پا گیا تھا

لیکن پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت مارشل لا لگا دیا گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا بدترین زمانہ ہے۔"(۳۸)

اس مارشل لاء کے خلاف شدید لہر اٹھی۔ اعجاز راہی کا پہلا مجموعہ "گواہی" ۱۹۷۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں آمروں کے ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج اور آزادی کی تمنا کو موضوع بنایا گیا۔ اس کی اشاعت پر آمر حکومت نے پابندی لگا دی۔ انہوں نے جرات مندانہ قدم اٹھایا جس کے نتیجے میں ایسی لہر اٹھی جو بعد میں تھم ہی نہ سکی۔ گواہی کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "اگر معصوم جسموں پر پڑھنے والے کوڑوں کی ظالمانہ آوازیں ادیب کے احساس کو مجروح نہیں کرتی تو ادب ٹھہرے ہوئے گندے پانی کے کائی زدہ جوہڑ سے بدتر ہے۔"(۳۹)

آغا سہیل نے اپنے افسانوں میں ضیاء الحق کے ریاکارانہ دور کو موضوع بنایا۔ ان کے افسانے "پرچم"، "زہر"، "کھڑکی"، "تل برابر آسمان"، "بے سمت راہیں" وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے افسانوں میں خوف اور جبر میں پورا معاشرہ مبتلا نظر آتا ہے۔

"اب جو دیکھا تو ایک بڑے آئینے میں ہماری گردنوں پر خچر سوار نظر آ رہے تھے۔ ہم حیرت سے بولے: ارے ہم خچر پر سوار ہیں۔ کسی نے مسکرا کر کہا: خچر ہم نہیں تم ہو ہم تم پر سوار ہیں۔"(۴۰)

مارشل لا کے اس جبری دور میں جتنے بھی اہل قلم ہیں، ان سب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ مارشل لاء کی فوجی آمریت نے سنجیدہ اور جمہوری مزاج ادیبوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس زمانے میں دیگر اصناف کی نسبت افسانے کو زیادہ پذیرائی ملی ڈاکٹر سلطانہ بخش کہتی ہیں:

"اس دور کی تخلیقات میں ایک طرف تو حزن و ملال، افسوس، مایوسی اور جبر کی موجودگی کا دکھ نظر آتا، دوسری طرف روشن مستقبل کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور کا ادب احتجاجی اور ردعمل کی مختلف سطحوں کا آئینہ دار ہے۔"(۴۱)

جدید عہد کی شہری زندگی اور ٹیکنالوجی نیز سائنس کی ترقی نے انسان کو آسائشوں کا عادی بنا دیا۔ انسان کی سوچ کو بدل دیا۔ مشینوں کی حکومت نے جہاں انسان کو سہولیات فراہم کیں وہیں بہت سے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ تمام شعبوں کا نظام الٹ ہو گیا۔ تعلیم کا شعبہ ہو یا عدالت، سرکاری دفاتر ہوں یا پرائیویٹ ادارے، ہر جگہ پیسے کو اہمیت دی جانے لگی۔ نااہل اور نالائق لوگ رشوت اور سفارش کے بل بوتے پر ترقی کرنے لگے۔ ممتاز مفتی کے افسانے "میاں کی مرضی" میں ان الفاظ میں اظہار کیا گیا: "آج کل جماعتوں کو کون پوچھتا ہے، کئی بی اے

دھکے کھا رہے ہیں۔ نوکری کو ترستے پھرتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ان کی سفارش پر سو روپے کی نوکری نہ ملی تو کہنا۔"(۴۲)

اسی طرح اشفاق احمد نے بھی شہروں کی کھوکھلی تصنع بھری زندگی کی منافقت کو موضوع بنایا۔ ان کے افسانے "ماسٹر"، "روشنی"، "اہل ویرا"، "فل برائٹ" وغیرہ میں شہری زندگی کی منافقتوں کو موضوع بنایا گیا۔

افسانے "سونی" میں مشینوں کی بڑھی ہوئی محبت پر طنز کرتے ہیں۔ اشفاق احمد مغربی ٹیکنالوجی کو انسان کے لئے زہر قاتل خیال کرتے ہیں کہ اس نے انسانی زندگی کو بے مقصد اور کھوکھلا بنا دیا ہے۔

> "بہت زیادہ پولیٹکس اور بہت زیادہ سیکس انسان کو دکھی بنا دیتا ہے۔ سہیل نے گلوگیر ہو کر کہا۔ یہ جتنا بھی گلٹ اس دنیا میں موجود ہے سیکس، پالیٹکس اور انفارمیشن کی وجہ سے ہے۔" (۴۳)

سائنس کی ایجادات کو اردو افسانے کو موضوع بنا کر عصری شعور کی عکاسی کی جیسے اسی کی دہائی میں جب کیلکولیٹر کا استعمال عام ہوا تو ہر خاص و عام نے اس کا استعمال کیا، اس نے انسان کے ذہن کو کند کر دیا۔ منشایاد اپنے افسانے "کوک بھرے کھلونے" میں لکھتے ہیں۔

> "یاد آیا کہ کیلکولیٹر ایجاد ہونے سے پہلے میں ایسی بہت سی لمبی لمبی ضربیں زبانی دیتا تھا اور مجھے سارے پہاڑے ازبر تھے، مگر اس کیلکولیٹنگ مشین نے ذہن کو کند کر کے رکھ دیا، مجھے ہی نہیں ساری نسل کو۔"(۴۴)

منشایاد عصر حاضر کے حساس اور باشعور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے "تماشا"، "درخت آدمی"، "خلا اندر خلا"، "ماس اور مٹی"، "ڈور کی آواز"، "ایک کنکر ٹھہرے پانی میں"، "دنیا کا آخری بھوکا آدمی" وغیرہ میں دور حاضر کے بدلتے ہوئے اطوار کی عکاسی کی۔ بانو قدسیہ نے بھی شہری زندگی کے جدید مسائل اور نئی ایجادات نے انسانی زندگی کو جس طرح متاثر کیا اسے افسانوں میں بیان کیا۔ اس حوالے سے ان کے افسانے "سوغات"، "ہو نقش اگر باطل" اور "ہاتھی دانت" وغیرہ اہم ہیں۔

محمد حامد سراج نے بھی جدید ٹیکنالوجی کی ایجاد کو موضوع بنایا کہ انسان کس طرح ان کا محتاج ہو گیا۔ ان کا افسانہ "نصف مکمل" میں موبائل فون جیسی ایجاد کو موضوع بنایا، جس کے بغیر آج کے جدید دور میں ایک قدم چلنا محال ہو گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس موبائل نے بھی جان عذاب میں ڈال دی ہے، سہولت اپنی جگہ، پل پل رابطہ بھی مان لیا لیکن عذاب بھی تو کم نہیں۔ لمحوں میں خبر ذہن میں انتشار پھیلا کر پورے وجود کو ریزہ ریزہ

کر دیتی ہے۔"(۴۵)

الغرض اردو افسانے نے شہری زندگی اور مشینوں کی حکمرانی کے نتیجے میں پیش آنے والے تمام عصری حقائق کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی۔

اسی طرح پاکستانی افسانہ نگاروں نے گیارہ ستمبر کے نتیجے میں ملکوں اور قوموں کے مابین جنم لینے والے نئے رشتوں کو دلسوزی سے سمجھنے کی کوشش کی۔ گیارہ ستمبر کے واقعے نے نہ صرف امریکی ادب بلکہ پاکستانی ادب کو بھی بہت متاثر کیا۔ اس واقعہ نے پاکستان کی سیاست، معاشرت، معیشت اور شہری و دیہاتی زندگی کے امن و سکون پر منفی اثرات مرتب کیے۔

نائن الیون کے حوالے سے مسعود مفتی کا افسانہ "شناخت"، جو ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا، جس کا موضوع گیارہ ستمبر کے واقعے سے پیدا ہونے والا عدم استحکام کی فضا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کی زندگی اس واقعے کے بعد بدل جاتی ہے۔ "خالد" جو مرکزی کردار ہے امریکی زندگی کا دلدادہ ہے، وہ ایک امریکی لڑکی فین سے شادی کر کے پیچھے اپنے ماں، باپ، بہن، بھائی، مذہب، تہذیب، اسلام غرض ہر شے سے رشتہ ناطہ توڑ لیتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو بھی یہی آزادی دینا چاہتا ہے۔ اس کے دوست اس کو سمجھاتے لیکن وہ کسی کی ایک نہ سنتا۔ اسی دوران اچانک نائن الیون کا واقعہ پیش آتا ہے جس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ خالد کا مدتوں سے خوابیدہ اور متروک تشخص بیدار ہونے لگتا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ امریکیوں کا رویہ اسے عدم تحفظ کا شکار کر دیتا ہے۔ وہ اپنے والدین سے ملنے پاکستان آتا ہے نتیجتاً وہ قربت محسوس کرتا اور اپنی شناخت کے قریب ہو جاتا ہے۔

افتخار نسیم کا افسانہ "پڑوسی" بھی شناخت کی تلاش کے گرد گھومتا ہے۔ اس کا اس کا مرکزی کردار "اسلم" اپنی شناخت ۱۹۴۷ء میں کھو دیتا ہے۔ ایک شخص اسے سب ظالموں سے بچا کر اپنے گھر لے آتا اور پرورش کرتا ہے۔ اس بچے کا مذہب ہندو ہے یا مسلمان اس معلوم نہیں ہوتا اور وہ اپنی شناخت سے محروم ہوتا ہے۔ پرورش کرنے والے آدمی کی وفات کے بعد اس کا بڑا بھائی اسے گھر سے نکال دیتا ہے اور وہ امریکہ جا کر مقیم ہو جاتا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا واقعہ وقوع پذیر ہوتا ہے تو امریکیوں کا رویہ بڑے بھائیوں جیسا ہو جاتا۔ چالیس سال گزارنے کے بعد وہ امریکہ سے نکل جانے کی دھمکی دے رہے ہوتے ہیں جبکہ اس کی نسل کے لوگوں کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی میں کوئی ہاتھ نہیں ہوتا لیکن پھر بھی Go Back Your Country والا جملہ دہرایا جاتا ہے۔

اس افسانے میں امریکہ کا منافقت بھرا چہرہ نظر آتا ہے جو سب انسان برابر ہونے کا درس دیتا ہے لیکن خود انصاف اور مساوات سے کوسوں دور ہے۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد پاکستانی اور امریکی مسلمانوں کا اس مکروہ چہرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

"اسلم پر بچپن سے لے کر اب تک کیا کیا نہیں گزری، مگر آج اس کو ڈرگ سٹور کی پارکنگ لاٹ میں جاتے ہوئے کار میں سے کسی امریکن کی آواز آئی Go Back To Your Coutry Mother F"(۴۶)

عصر حاضر کے معروف افسانہ نگار نیلوفر نے "آپریشن ماسٹر" کے عنوان سے گیارہ ستمبر کے بعد امریکی انتظام کی کہانی لکھی۔ ٹاورز گرنے کے بعد امریکہ انتقام لینے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار جنرل مرسی کی ایک کتیا بلیر ہے جو کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جس کا علاج صرف موت ہے۔ لیکن جنرل مرسی اپنی کتیا کے لئے بہت نرم اور محبت کے جذبات رکھتا ہے اس دوران جنرل کو ایک اہم میٹنگ کے لیے جانا پڑتا ہے جو "اوپریشن مائی" سے متعلق ہوتی ہے۔ اس میٹنگ میں عربوں کو ختم کرنے کے اور تیل کے ذخائر پر قابض ہونے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ "لیکن خزانہ ہو لیکن بہت ہی بڑا خزانہ، دنیا کا سب سے بڑا خزانہ، تمہارے تصور سے بھی بڑا خزانہ اور اس پر چوہوں کا قبضہ ہو تو۔۔۔۔۔۔؟"(۴۷)

اس افسانے میں نیلوفر نے بڑی جانبداری سے دونوں طرف کے نقطہ نظر کو واضح کیا کہ امریکہ کس طرح عراق کے تیل کے ذخائر کو بھوکی نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ عربوں کے لئے "چوہے" کا لفظ استعمال کرتا ہے جو دنیا کی بڑی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ عرب ممالک کا خود کفیل ہونا امریکا سے برداشت نہیں ہو رہا ہوتا۔

محمد حمید شاہد نے بھی نائن الیون کے واقعے کے بعد پیدا ہونے والی معاصر صورتحال کو اپنے افسانے "ہسوئرک میں سوز" میں تمثیلی انداز میں پیش کیا۔ اس افسانے میں بتایا گیا کہ ایک بستی والے بکریوں کے ریوڑ پالتے ہیں۔ بستی میں ایک نئی صورت حال سامنے آتی ہے کہ جنگلی سور بکریوں پر حملہ کرتے ہیں۔ ان جنگلی سوروں سے نجات کے لئے بستی والے کچھ کتے پال لیتے ہیں لیکن بعد میں یہ کتے سوؤروں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ تمام حفاظتی اقدامات کارآمد ثابت نہیں ہوتے۔ افسانے میں حمید شاہد کہتے ہیں۔ "جب تھوتھنیوں والے آئے ہیں، دکھ موت کی اذیت سے بھی شدید اور سفاک ہو گئے ہیں۔"(۴۸)

تھوتھنیوں کا لفظ مغربی استعمار کے لیے استعمال کیا ہے کہ مغربی استعمار عالمی گاؤں بننے کی آڑ میں پوری دنیا کو نقصانات پہنچاتے ہیں۔ انسانی خون کو ارزاں کر دیتے ہیں۔ عراق اور افغانستان میں امریکہ نے جو سلوک روا رکھا وہ سوؤروں والی حرکات تھیں۔

نائن الیون کے پس منظر میں اردو میں بڑی تعداد میں لکھاریوں نے قدم اٹھایا ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی کتاب میں بائیس افسانے مرتب کئے جس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس دور میں لکھاریوں نے عوام کے دکھ کو

محسوس کرتے ہوئے افسانوں میں ان کے مسائل کی نشاندہی کی۔اردو افسانہ ہمیشہ زندگی میں رونما ہونے والے ہر واقعے کو اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مغرب میں رونما ہونے والی تمام تحریکوں کے اثرات بھی اردو افسانے میں موضوعاتی، فنی، فکری پہلوؤں پر رونما ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں۔

> ''عصری آگاہی کے نقطہ نظر سے جب پون صدی پر محیط افسانے کا افسانہ سنیں تو یہ محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری تاریخ کے ہر موڑ، ہماری تہذیب کی ہر کروٹ پر ہمارے تمدن کے ہر تغیر پر کہانی نے زندگی کا ساتھ دیا۔''(۴۹)

۲۰۱۰ء میں اس واقعے کے ۹ سال گزر جانے کے بعد بھی لکھاریوں کے ہاں اس کے اثرات تخلیقات میں نظر آتے ہیں کیونکہ نائن الیون کے بعد امن وامان کی صورتحال یکسر بدل گئی تھی۔ شہر محفوظ نہیں رہے تھے دفتر، مساجد بازار، چوک ہر جگہ موت کا خطرہ منڈلاتا رہتا تھا۔انسان کو ہر جگہ موت نظر آتی تھی۔امن وامان کی خراب صورتحال کو معاصر افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ معاصر افسانہ نگار فرخ ندیم نے بھی معاصر صورتحال کو موضوع بنایا۔آپ نے تحریر میں اس بات کو اجاگر کیا کہ نائن الیون نے ملک کو دھماکوں کی راہ پر ڈال دیا ہے۔

آپ نے انسانی جنگوں کو تسبیح کے دانوں سے تشبیہ دی جس طرح تسبیح کے دانے زمین پر بکھر جاتے ہیں اسی طرح انسانوں کی لاشوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھر جانا بھی اذیت ناک عمل سے کم نہ تھا۔اس کیفیت کو ان الفاظ میں عیاں کیا گیا۔''ایک دھماکہ ہوا اور زندگی ٹوٹ کر یوں بکھری جیسے مسجد کے فرش پر تسبیح کے منکے یا طوفانی زلزلے میں بستیاں پہاڑوں سے گرتی پرکھوں کی ہڈیاں تک ہلا دیتی ہیں۔''(۵۰)

اس اقتباس سے انسانی جانوں کی پامالی کی دردناک تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ انسانی جان کس طرح ارزاں ہو کر ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔اسی افسانے میں آگے چل کر میڈیا کا منفی کردار بھی سامنے آتا ہے اور قوم کا جذباتی بن جس کے سبب منفی خبر کو میڈیا بریکنگ نیوز بنا کر بار بار ٹی وی، ریڈیو پر اچھالتے ہیں جس کی وجہ سے قوم سوگواریت کا شکار ہو جاتی ہے جیسا کہ: ''ملکی غیر ملکی اور نجی ٹیلی ویژن گلا پھاڑ پھاڑ کر بول رہے تھے کہ پاکستان چوک میں الامان کے پرخچے اڑ چکے ہیں۔''(۵۱)

مندرجہ بالا سطور ہمارے جذباتی پن کی عکاسی کرتی ہیں کہ صحافت جو کہ ایک مقدس شعبہ ہے ایسی خبر بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ معاصر دور میں عام بات سمجھی جانے لگی ہے۔دھماکہ جس جگہ پر ہوتا ہے وہاں عجیب قسم کی قیامت کا سماں ہوتا ہے۔ دھماکے کے بعد ہر طرف صرف اور صرف تباہی نظر آتی ہے۔اس کے بعد صرف سسکیوں کی آوازیں باقی رہ جاتی ہیں۔اس کیفیت کو عکاسی فرخ ندیم کے ہاں ان الفاظ میں ملتی ہے۔

''دھماکہ ہوااور کئی من جسمانی ملبہ چھوٹی بڑی سفید شیشوں والی گاڑیوں پر اس شدت سے سرخ تھپڑ برسانے لگا کہ سب الٹے ٹائروں کی چیخیں نکالتے بیک مرر کے سہارے مڑتے ہوئے ورکشاپوں میں کھانس کھانس کر سانس بحال کرنے لگے۔''(۵۲)

یہ تمام حالات نائن الیون کے بعد امریکہ اور افغانستان کی جنگ کی دین ہیں۔یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی وحشیانہ کاروائیوں کے بعد کی صورتحال نے ادیبوں کو بہت متاثر کیااور پاکستان امریکہ کا اتحادی بن کر ڈرون حملوں کو کھلے عام دعوت دینے لگااس ضمن میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کہتی ہیں۔

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس اہم واقعے کے کئی دوسرے پہلو بھی فکشن کا موضوع بننے لگے۔ان میں افغانستان پر وحشیانہ امریکی بمباری اور عراق پر حملے کی وجوہات سے لے کر پاکستان میں خودکش حملوں اور بم دھماکوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی لہر۔۔۔۔افسانہ نگاروں کی بھرپور توجہ کا مرکز رہے ہیں۔''(۵۳)

خالد فتح محمد بھی عصر حاضر کے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے امن وامان کی صورتحال کو اپنے افسانے ''اور طرح کی جنگ''میں اس طرح بیان کیا۔

''بچے ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے ان کی آنکھوں میں معصومیت، جارحیت محرومی اور اشتیاق تھا۔مجھے اپنے جسم میں کپکپی سی محسوس ہوئی اور احساس ہوا کہ اپنے سیکیورٹی گارڈ کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔''(۵۴)

نائن الیون کے بعد پاکستان کا خوبصورت شہر پشاور اجڑ کر رہ گیا۔ہر روز دھماکوں نے پاکستان کو اندرونی طور پر کمزور کر دیا۔اسی طرح معاصر افسانہ نگاروں میں عرفان عرفی نے بھی ایسے سوالات اٹھائے جو معاصر کے نوحہ کہلانے کے حقدار ہیں۔''تو یہ بتاؤ آج سنا ہی پھر دھماکہ ہوا ہے۔کتنے مارے گئے؟ کتنی ماؤں کی گودیں اجڑ گئیں؟آخر کب تک ہوتا رہے گا۔چھوڑیں آنٹی یہ دور کی بات ہے۔''(۵۵)

اس طرح حامد سراج نے اپنے افسانے ''کالی دیواریں''میں موجودہ دور کی فرقہ واریت کو اجاگر کیا۔ایک مکتبہ فکر والے دوسرے مکتبہ فکر کے جانی دشمن ہو گئے۔بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا۔کہانی کا مرکزی کردار ایک نئی بستی میں جاتا ہے وہاں مسجد کو تالا لگا دیتا ہے تو ایک عورت سے تالا لگانے کی وجہ پوچھتا ہے کہ ادھر اللہ کا کوئی گھر ہے تو وہ بتاتی ہے کہ یہاں صرف فرقہ واریت ہے۔جس کی بھینٹ اس کے تین بچے چڑھ چکے ہیں۔وہ جب میزبان کے کمرے سے دوسرے کمرے میں آتا ہے تو یہ آوازیں سنتا ہے۔''جن دس کا چناؤ ہم نے کیا ہے یہ پچیس

ہزار پر بھاری ہیں۔ایک ایک نامور ہے۔"(۵۶)

امن وامان کی ناکارہ صورت حال نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ بڑے بڑے فنکار اور تمام شعبوں میں نمایاں کارکردگی دکھانے والوں کو موت کا سامنا کرنا پڑا۔ صوبائی تعصبات کو اتنی ہوا دی گئی کہ فسادات کی شکل اختیار کر لی۔ بلوچستان کے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ اسلحے کا استعمال عام ہو گیا۔ دہشت گردی کو مدرسوں کے ساتھ جوڑا جانے لگا۔ جیسا کہ۔ "اب اسلحے اور مدرسے کے کاروبار نے بہت سے لوگوں کے دن پھیر دیے ہیں۔"(۵۷)

معاصر انسان کے اندر سکون کی جگہ بے چینی اور اضطراب نے لے لی ہے۔ سائنسی ایجادات نے انسان کی زندگی کو جہاں سہل بنایا وہیں کچھ منفی اثرات بھی سامنے آئے۔ اسلحے کی دوڑ نے انسانی جان کو ارزاں کر کے چیونٹی سے بھی کم تر بنا دیا ہے۔ صنعتی ترقی نے جہاں سرمایہ داری کو ترقی دی وہیں کچھ ایسے اقدامات بھی کیے جو انسان کے لیے وبال جان ثابت ہوئے۔ صبا اکرم نے اس کیفیت کی ان الفاظ میں عکاسی کی ہے۔

> "دراصل سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقی کے عروج نے جہاں ایک طرف اس عہد کے انسانوں کے لیے بیشمار مواقع اور سہولتیں مہیا کیں وہیں دوسری طرف ان گنت خطرات اور ان گنت چمکتی تلواریں بھی اس کے سر پر لٹکا دیں۔"(۵۸)

اسی طرح اپنے ہی ملک میں اپنے ہی لوگوں کو مہاجر بننا پڑا۔ وزیرستان میں آپریشن کے بعد پیدا ہونے والی دہشت، خوف کو رشید مصباح نے اپنے افسانے "خاک زادے" میں بیان کیا کہ انسان کے خون کو کس قدر ناقدری سے بہایا جانے لگا۔ انسانوں کے خون کی ارزانی نے فرد کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار کر دیا۔ اس کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی۔

> "علی شیر پریشان ہو کر اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس کے ذہن میں ان دیکھی مناظر بھرنے لگے وزیرستان کے کسی علاقے میں گولے برس رہے ہوں گے کئی مکان ملبے کا ڈھیر بننے کے ساتھ ساتھ آگ کی لپیٹ میں آ چکے ہوں گے اور لازماً بہت سے انسان لقمہ اجل بن گئے ہو گے۔" (۵۹)

اس طرح ان تمام حالات میں عام انسان کی زندگی تباہ ہوتی ہے جو صدیوں کی جمع پونجی سے گھر تعمیر کرتا ہے جو بم کا نشانہ بن کر نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ نائن الیون کے بعد مغربی ممالک نے اسلام دشمنی کا کھل کر اظہار کیا۔ مغربی ممالک نے اسلام کی اصل شکل کو مسخ کر کے پیش کیا۔ اپنے ہاں آنے پر مزید سختیاں پابندیاں لگا دیں اور خود دنیا بھر میں آزادی سے گھوم رہے ہیں۔ انور زاہدی نے اپنے افسانے "پرانے کاغذوں" میں رقمطراز ہیں

"یہ ساری بندش اس لئے لگائی جارہی تھیں کہ اب یورپ امریکہ اور کینیڈا کے ممالک بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر امیگریشن کی پالیسیوں میں دن بدن سختی کیے جارہے ہیں اس کے باوجود ہمارے ہاں برین ڈرین میں کمی کی بجائے دن بدن اضافہ ہورہا ہے۔"(۶۰)

نائن الیون کے بعد بیسویں صدی سے جب نئی صدی کا آغاز ہوا تو نائن الیون کا واقعہ رونما ہوا جس نے انسان کو متاثر کیا۔ زندگی جتنی تیز ہوئی اتنی ہی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ گیارہ ستمبر کے واقعے نے پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دیں۔ پیسے کی لالچ میں پرائی جنگ لالچی حکمران پاکستان کے اندر لے آئے، جس نے پاکستان کے بچے سے لے کر بوڑھے کو بھی متاثر کیا۔ اپنے ملک میں رہتے ہو میں عدم تحفظ کا احساس ہونے لگا ہر فرد پر پابندیاں اتنی ہی لگائی جارہی ہوتی ہیں کہ فرد خود کو ملزم سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے دفاعی پالیسیوں اور ان کو پوری طرح سے بند کیا ہوا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر نجیبہ عارف رقمطراز ہیں:

"زندگی کی تمام تر فعالیت، معاشی، عسکری اور سیاسی منصوبہ بندیوں سے متاثر ہو رہی ہے۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ سے لے کر جگہ جگہ پر لگائے علاقوں تک رکاوٹ اور بند باندھنے کا احساس زندگی کی ہر حرکت اور سمت کو متاثر کر رہا ہے۔ پاکستان میں انتشار اور زوال کا یہ عمل ہر ذہن کو سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔"(۶۱)

نائن الیون کے بعد جو ادب تخلیق ہوا اس میں انسان کی شکست وریخت کی عکاسی کی گئی اور انسان عدم تحفظ کا شکار ہو گیا۔ حفاظت کے نام پر انسان کی نجی زندگی کو متاثر کیا گیا۔ کرب اور اجنبیت کی کیفیت ہر طرف منڈلانے لگی۔ آج کے تخلیق کار نے اس کرب کو شدت سے محسوس کیا اور اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان افسانوں کے جائزے کے بعد عصری صورتحال کی مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ آج بھی نائن الیون کے اثرات ہمارے سماج میں موجود ہیں۔ معاصر ادیبوں کے ہاں آج بھی اس کی عکاسی ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تو تاریخ کے دھارے نے ایک اہم موڑ لیا۔ صنعت کے فروغ نے مختلف ممالک میں صنعتی انقلاب برپا کیا۔ مختلف ممالک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہو گئے۔ برطانیہ اور فرانس ترقی یافتہ ممالک کی صف میں گردانے جانے لگے۔ انہوں نے دوسروں کو اپنا مطیع بنانا شروع کیا جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

انگلینڈ نے برصغیر میں آکر نوآبادیات قائم کیں۔ اس طرح مشرق و مغرب کا ملاپ قائم ہوا یہ گلوبلائزیشن کا اہم دور تصور کیا جاتا ہے۔ گلوبلائزیشن کے لیے اردو اصطلاح "عالمگیریت" مستعمل ہے۔ یہ عربی کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی علاقائی یا مقامی رسم ورواج کو عالمگیر بنانا ہے۔

اس عالمگیریت کی آڑ میں ترقی یافتہ ممالک نے غریب ممالک کو بطور منڈی استعمال کر کے وسائل کو بھی لوٹنے کی کوشش کی۔ عالمگیریت ایک نئی جہت ہے جس کے بہت سے فوائد اور نقصانات بھی ہیں۔ عالمگیریت میں ترقی یافتہ ممالک کا مقصد ترقی پذیر ممالک سے خام مواد حاصل کرنا اور ان کے ذخائر پر قبضہ کر کے فائدہ اٹھانا بھی ہے۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے ملٹی نیشنل کمپنیاں وجود میں آئیں۔ انہوں نے دوسرے ممالک کا رخ کیا جہاں انہوں نے کمزور ممالک کو محکوم بنایا، ان کی سیاست میں دخل اندازی کرنا شروع کر دیں۔ ان کو سہولیات مہیا کیں۔ لوگوں کے روابط آپس میں بڑھے دنیا سمٹ کر رہ گئی۔ ''ہماری دنیا بین الاقوامی ہے۔ ہستی کی Existence فضا سے نکال کر بین الاقوامی طاقتوں کی مرہون منت ہو گی۔''(۶۲)

ٹیلی فون اور انٹرنیٹ کی ایجاد نے عالمگیریت کے سلسلے میں انقلاب برپا کر دیا، جس کی بدولت ٹیلی فون، انٹرنیٹ، جہاز کی موجودگی میں سفر آسان، رابطہ سہل ترین اور افراد کا میل جول اس قدر آسان ہو گیا کہ لوگوں سے اجنبیت مٹنے لگی۔ ان اشیاء نے عالمگیریت کی شکل واضح کی۔

> "The airplane the telephone and internet are just three inventions which are attributable to spread of globalisation."(۶۳)

عالمگیریت نے انسان کو بہت سے فوائد سے نوازا ہے. آج کے جدید دور میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیغام رسانی کے سلسلے اور آسان ذرائع میسر ہیں. انسان کی خوراک کے مسائل میں کمی آئی ہے۔ دنیا کے جس حصے میں غذائی قلت محسوس ہو تو دوسرے کونے میں آسانی سے خوراک پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس کی بدولت فرد کو دوسری تہذیبوں سے آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح جہاں کچھ فوائد ہیں وہاں نقصانات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عالمگیریت کے ذریعے دنیا کے دوسرے ممالک میں پیدا ہونے والی بیماریاں دوسرے ممالک تک منتقل ہو جاتی ہیں جیسا کہ ایڈز کی بیماری افریقہ اور جنوبی امریکہ سے پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اسی طرح قومی تہذیبیں ہر ملک کی اپنی پہچان ہوا کرتی ہیں لیکن اب معدومی کے خطرے سے دوچار ہیں۔ امریکیت اور مغربیت کی غالب تہذیب پوری دنیا کو لپیٹ میں لے چکی ہیں. یہ اس کا منفی پہلو ٹھہرتا ہے اور سرمایہ دار ممالک غریب ممالک کو اپنی مصنوعات کے لیے بطور منڈی استعمال کرتے ہیں۔ عالمی بینک، آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او جیسے ادارے وجود میں آئے۔ ان اداروں نے غریب اور پسماندہ ممالک کو مزید غریب کیا اسی طرح عالمگیریت کے منفی اثرات بھی کچھ ممالک پر

وارد ہونا شروع ہوئے۔ادیب معاشرے کا حساس ترین رکن ہوتا ہے۔معاشرے کی تمام جہات کی عکاسی کر کے عالمی گاؤں کا رکن نظر آتا ہے ہے جیسا کہ۔''ہمارا جدید افسانہ زمین اور زمانے سے اوپر اٹھ کر ادب کے عالمی گاؤں کا رکن بن گیا ہے۔'' (۶۴)

جب سائنسی ترقی ہوئی تو ہر چیز بدل گئی۔ شہر گاؤں کے قریب آ گئے۔ گاؤں کی مخصوص فطرت نگاری معدوم ہوتی گئی۔ سادگی کی جگہ نمود و نمائش نے لے لی۔لوگوں کے درمیان مقابلے کی فضا پیدا ہو گئی۔ فیشن، برانڈڈ لباس، خوبصورت بڑے گھر وغیرہ دکھاوے کی واضح عکاسی کرنے لگے۔ فرد میں سیلفی کا کلچر پروان چڑھنے لگا۔لباس نمود و نمائش کے لیے ٹھہر گیا۔ بڑے بڑے ہوٹل میں کھانا کھایا جاتا تو سوشل میڈیا پر باقاعدہ جگہ کی لوکیشن ڈالی جاتی، موبائل سے تصویر لگا کر سوشل میڈیا پر دکھائی جاتی۔اس کا مقصد صرف دوسرے لوگوں کو بتانا تھا کہ وہ کتنے ماڈرن ہیں،ان کا لائف سٹائل کتنا اچھا ہے،اس سے غریب طبقے کے اندر محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔آج کے انسان نے خود کو آسائشات کا غلام کر لیا ہے۔اس ضمن میں علامہ اقبال کا شکوہ بجا ہے۔

؎ تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ہیں ایرانی
لہوں مجھ کو رلاتی ہے جواں کی تن آسانی

ہمارے عہد کا المیہ ہے کہ دیہاتی تہذیب کی جگہ شہری تہذیب نے لے لی ہے۔ انسان آسائشات کا گرویدہ ہو گیا ہے گاؤں کی سخت جان زندگی کی جگہ سہل پسندی عام ہو گئی۔ مٹتی ہوئی تہذیبی قدروں کی جانب ڈاکٹر نذیر تبسم نے کچھ یوں اشارہ کیا:

> ''ساری دنیا کا ایک عالمی گاؤں میں سمٹنے کے تصور نے مغربی اقوام کی تہذیبی شناخت پر کاری ضرب لگانا شروع کر دی ہے۔انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی سیٹلائٹ کی سہولت اور سینکڑوں چینلز کی دستیابی نے مختلف زبانوں اور ثقافتوں کی مخصوص مہکار کو مجروح کر دیا۔'' (۶۵)

بدلتی ہوئی دنیا جب عالمی گاؤں کی صورت اختیار کر چکی تو عالمگیریت نے مقامی تہذیب اور شناختوں کو ٹھیس پہنچائی۔امریکیت کا غلبہ ہر طرف نظر آنے لگا۔اس دور میں بڑی بڑی بیماریوں کا سامنا بھی ہوا۔آج سے پہلے آپریشن کو ایک بلا تصور کیا جاتا لیکن اب معمولی بات سمجھی جانے لگی ہے۔انور زاہدی نے اپنے افسانے ''رحال متی'' میں اس بات کی نشاندہی کی۔ ''سنا ہے آپریشن کا سنتے ہیں سارے خاندان میں شور مچ گیا۔اس زمانے میں آپریشن کا ہونا آخری بات سمجھا جاتا تھا۔ان دنوں بیماریاں اتنی عام نہ تھیں۔''(۶۶)

اسی طرح اس عہد کا فرد فرصت کے لمحوں کو ترس گیا ہے۔ آج کا فرد گلوبل ولیج کا حصہ ہے، جس میں فرد نے آسائش کو اپنی زندگی کا حصہ بنادیا ہے۔ جس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے معاصر انسان سر گرداں رہتا ہے۔ موبائل کی ایجاد نے انسان کی زندگی کو اور بھی الجھن کا شکار کر دیا ہے۔ پہلے جو سب کا مل بیٹھنے کا رواج تھا وہ اب موبائل کی ایجاد سے عنقا ہو گیا ہے۔ لوگ موبائل پر ہی بات چیت کر لیتے ہیں۔ اسی طرح مشاعروں کا رواج بھی ختم ہوا۔ آج کا شاعر بھی اپنی شاعری سوشل میڈیا پر ڈال کر پذیرائی حاصل کر رہا ہوتا ہے۔

نیز موبائل اور انٹرنیٹ نے آج کے انسان کو کتاب سے بھی دور کر دیا ہے۔ انسان کے پاس کتاب پڑھنے کا وقت ہی درکار نہیں جیسا کہ

> ''مطالعہ کا وہ بچپن سے شیدائی تھا۔ اس کے بچپن کے زمانے میں ٹی وی ابھی نیا نیا آیا تھا اور بہت کم گھرانوں میں میسر تھا۔ اس لئے مطالعہ اس زمانے کی سب سے بڑی اور سستی تفریح تھا۔''(٦٧)

اس اقتباس میں بدلتے ہوئے عہد کی طرف اشارہ ہے لیکن صرف ٹیوی کو کتاب کش قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آج کے جدید دور میں انٹرنیٹ اور موبائل نے انسانی زندگی پر انمٹ نقوش مرتب کیے ہیں۔ عالمگیریت کا سب سے بڑا نمائندہ آج موبائل ہے، جس نے مقامی اقتدار کو معدوم کر کے مغربی تہذیب کو غالب کر دیا ہے لیکن اس کے کچھ مثبت اثرات بھی سامنے آتے ہیں۔ مواصلات اور اطلاعات کی ترقی نے نے پوری دنیا کے فاصلے سمیٹ دیے۔ دور دراز کے علاقوں میں بھی جدید ٹیکنالوجی کا استعمال عام ہوتا نظر آرہا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کے ترقی یافتہ ممالک علاقوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے ذہنی اور جسمانی فاصلوں کو مٹادیا ہے۔ معاشرتی سطح پر ہونے والی ان تبدیلیوں کو ہمارے عہد کا افسانہ نگار بہترین انداز میں بیان کرتا ہے محمد الیاس کا افسانہ ''خاندانی لوگ'' اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے

> ''گو کہ ہم ایک ہی شہر میں رہ رہے ہیں میرے میکے اور سسرال میں ہر سہولت موجود ہے ویڈیو لنک کے ذریعے بھی بات کر سکتے ہیں بالکل آمنے سامنے اور ملاقات کرنے پر بھی پابندی نہیں۔''(٦٨)

اسی طرح اس عہد کے جدید نظریات نے معاشرے پر مثبت اور منفی دونوں اثرات چھوڑے ہیں۔ یورپ سے آنے والے افکار کو ہمارے لوگوں نے ماڈرن کے طور پر لے لیا ہے۔ جس سے ہماری زندگیوں میں واضح تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ہماری مشرقی عورت مغربی عورت کی طرز پر زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ قمیض شلوار کی

جگہ عورت نے لباس کے طور پر پینٹ شرٹ کو ترجیح دی ہے۔ مشرقی عورت کے اندر پردے کا رجحان عنقا ہو چکا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

''معاشی بدحالی، مصارف زیست میں اضافہ، موزوں رشتوں کی کم یابی کے باعث لڑکیاں اب تعلیم سے زیور کا کام نہیں لے رہی بلکہ استانیوں، نرسوں جیسے زنانہ پیشوں ہٹ کر زیادہ تنخواہوں کے لیے بینکوں، فرموں، دفتروں اور دکانوں میں پہنچ چکی ہیں۔اب وہ برقعہ میں چلنا پسند نہیں کرتیں۔''(۶۹)

معاصر افسانہ نگاروں نے ہمارے عہد کے نوجوان کے اس رجحان کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا کہ آج کے عہد کا نوجوان اچھی اور اعلی تعلیم کے بعد بہتر روزگار اور زیادہ پیسے کی خاطر مغربی ممالک کا رخ کرتا ہے۔انور زاہدی کا افسانہ ''پرانے کاغذوں میں'' اس بات کی عکاسی کچھ یوں کی گئی ہے۔

''شادی کے کچھ ماہ سہیل اپنی بیوی کے ساتھ میرے پاس رہا پھر اسے آسٹریلیا میں ملازمت مل گئی اب وہیں مستقل رہائشی بن گیا۔ نبیل اپنی ڈگری لیتے ہی کینیڈا کی امیگریشن میں لگ گیا تھا اور اب نبیل کو بھی گئے ہوئے کئی ماہ ہونے کو ہیں۔''(۷۰)

باہر ملازمت کرنا کوئی معیوب بات نہیں لیکن مستقل سکونت اختیار کرنا قابل ستائش بھی نہیں۔اسی طرح عالمگیریت کی زد میں مشرقی انسان نے مغربی تہذیب کو اپنا لیا ہے۔ مغرب میں والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان کو اولڈ ہوم میں بھیج دیا جاتا ہے اسی طرح یہ رجحان مشرقی معاشرے میں بھی عام ہونے لگا ہے۔تو اس ضمن میں الطاف فاطمہ کا افسانہ ''مسز ین ہیروز سکول'' میں اس رجحان کی عکاسی کی گئی۔

''وہ یہ کہ اب اولڈ ہاؤس میں داخل کروادیں۔انہوں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا جیسے یہ انہیں بری لگی ہو۔اولڈ ہاؤس۔۔۔۔اونو۔۔۔ہوریبل پلیس۔۔۔(خوفناک جگہ) وہاں کے رہنے والے دیکھنے میں تو زندہ ہوتے ہیں مگر وہ جذباتی اور نفسیاتی طور پر مر چکے ہوتے ہیں۔''(۷۱)

عصر حاضر میں مشرقی اخلاقیات کو زنگ لگ چکا ہے۔ مغرب سے آنے والی افکار نے زندگی کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ مغربیت نے انسانی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔جدید ٹیکنالوجی نوجوان نسل کے اندر اس قدر گھس گئی ہے کہ وہ اپنے سگے رشتوں کو بھول چکے ہیں۔وہ جسمانی طور پر اپنوں کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن ذہنی طور پر فیس بک اور وٹس ایپ پر چلے جاتے ہیں۔بچوں کو جدید آلات سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اپنے والدین

کے پاس بیٹھیں اوران سے بات کریں۔اسی طرح موبائل فون نے مرد اور عورت کے درمیان فاصلے کو کم کر دیا ہے۔آج کے دور میں مرد اور عورت کا آپس میں ملنا ایک عام سی بات ہو گئی ہے لیکن اس آزادانہ تعلق کے باعث جنسی اختلافات سامنے آتے ہیں۔ نوجوان اپنے جنسی جذبات پر قابو پانے سے قاصر ہیں جس کے باعث یہ صورتحال جنم لیتی ہے۔

> ''جب سے ہم نے موبائل پر جنسی چیٹ شروع کی تھی یہ ہمارے اکیلے میں ہونے والی پہلی ملاقات تھی۔ میں اپنے کمرے کی طرف چل پڑا اور وہ میرے پیچھے آ گئی۔۔۔۔اس دوپہر وہ سب دوہرایا گیا جو لفظوں کے ذریعے سکرین پر لکھتے ہیں۔''(۷۲)

جنسی اختلاط کی جھلک مندرجہ بالا اقتباس میں واضح نظر آ رہی ہے۔نوجوان نسل اپنے جذبات میں اس قدر بہہ جاتی ہے کہ اس کو دینی اور اخلاقی تمام اقدار بھول جاتی ہیں۔آج کے جدید ٹیکنالوجی کے دور میں اس مسئلے سے مزید بگاڑ پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے لکھا ہے۔

> ''المختصر نفسیاتی اور جنسی زاویہ نگاہ، جدید افسانہ نگاروں کے ہاں مخفی یا جلی انداز میں آج تک سانس لے رہا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو جب تک انسان کے اندر جذبات واحساسات کا کھیل جاری رہے گا یہ انداز نظر مر نہیں سکتا۔فقط اس کی لے میں کمی بیشی ہوتی رہے گی۔''(۷۳)

ہم عصر اردو افسانے پر عالمگیریت کی گہری چھاپ آتی ہے۔ہم عصر افسانہ نگاروں نے ہمارے سماج میں پائی جانے والی تمام بے رحم بیماریوں کی عکاسی کی ہے کیونکہ آج کے جدید معاشرے میں قناعت عنقا ہو چکی ہے ہر فرد آگے بڑھنے کی دوڑ میں شامل ہے۔معاصر افسانہ نگار معاشرتی وسماجی تمام مسائل کو اپنا موضوع بناتا ہوا نظر آتا ہے۔

اجمالی جائزہ

ساٹھ کی دہائی نے پاکستانی معاشرے پر سیاسی، سماجی اور معاشرتی حوالوں سے گہرے اثرات مرتب کیے۔اس عہد میں جنرل ایوب خان نے جمہوریت کے نظام کو متعارف کرایا اور معاشی سطح پر زراعت وصنعت کے شعبوں کو ترقی دی جو روزگار کی شرح میں مثبت تبدیلیوں کا موجب بنا۔اس نے انسانی زندگی کو مصروف بنایا۔انسان کے اندر ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا شعور پیدا ہونے لگا۔انسانی سوچ بدلی تو عورت نے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم رکھا۔ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی۔گھر کا ہر فرد زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے لگا۔

ساٹھ کی دہائی میں جہاں صنعتی ترقی ہوئی وہیں نت نئی سائنسی ایجادات میں بھی اضافہ ہوا۔ ٹی وی ریڈیو اخبارات وغیرہ نے دوریوں کو مٹادیا۔ انسان تمام حالات سے باخبر رہنے لگا۔ دنیا گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر گئی۔

ایسے میں نئی تہذیبی اور شہری ماحول نے نفسیاتی طور پر فرد کو متاثر کیا۔ اخلاقی اقدار خطرے کا شکار ہوئیں، سائنسی اور صنعتی ترقی نے فاصلوں کو سمیٹا، ہر چیز کو دوسری چیز کے قریب تر کر دیا لیکن انسان اس ترقی کی بھیڑ میں اس قدر کھو چکا ہے کہ اس کے پاس اپنوں کے لئے بھی وقت نہیں ہے۔ اس طرح انسان کے سماجی رویوں میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انسان اخلاقی روایات سے نابلد ہوتا گیا۔ رشتوں کی ظاہری صورت بدل رہی تھی۔ انسانوں کے ایک دوسرے سے دور ہونے اور آپس کے اختلافات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایوب خان کے دور کی آزادانہ پالیسیوں نے زیادہ تر فائدہ چند افراد اور خاندانوں تک پہنچائے جس سے دولت چند خاندانوں تک محدود رہ گئی۔ ملک میں غربت کی شرح میں اضافہ ہوا جس سے سماجی طبقات کا عمل تیز ہو گیا۔ عام آدمی اس صنعتی ترقی کے جواز کے بارے میں سوال اٹھانا شروع ہو گئے۔

درج بالا تمام مسائل نے عوام کو ایوب حکومت کے خلاف احتجاج پر مجبور کر دیا۔ ان احتجاجوں، ہڑتالوں اور معاشرے میں انقلابی رجحان کے بڑھنے کے خدشات نے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو مجبور کر دیا کہ وہ ایوب خان سے استعفی لے۔ ایوب خان کے اس دور میں نئی سائنسی ایجادات، ٹیکنالوجی اور نئے انکشافات نے فرد کے ماحول کو داخلی اور خارجی سطح پر انتشار کا شکار کر دیا جس سے فرد کی جذباتی اور فکر سوچ میں تبدیلی آئی۔ اس چیز نے عدم تحفظ کی ایک نئی صورتحال کو جنم دیا جس کے اثرات معاشرے کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی پڑے۔

ادب نے اپنے موضوعات کا رخ انتشار، مایوسی اور بیزاری، احتجاج، برہمی، تنہائی، اجنبی وغیرہ جیسے موضوعات کی طرف موڑ دیا۔ کیوں کہ ساٹھ کی دہائی پاکستانی معاشرے میں سماجی اور سیاسی دونوں حوالوں سے الجھنوں کا زمانہ ہے۔ پہلا مارشل لا لگے دو سال کا عرصہ بیت گیا، اس کی ظاہری چمک دمک ماند پڑ چکی تھی، نئی لسانی تشکیلات کے نتیجے میں علامتی انداز فنی حوالوں سے سامنے آیا۔ افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے موضوعات اور مزاج کے مطابق افسانے میں تمثیل، علامت، تشبیہ، استعارہ، علامتی اور تجریدی انداز کو بھرتا۔ جدید افسانہ نگاروں میں انور سجاد، خالدہ حسین اور انتظار حسین سامنے آئے۔

اسی طرح ستر کی دہائی میں میں افسانہ عصری آگہی کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں اردو افسانے نے بین الاقوامی مسائل، ۱۹۶۵ء کی جنگ، سقوط ڈھاکہ کا حادثہ، ہجرت، قومی تشخص جیسے سوالات، صنعتی ترقی اور عوامی استحصال اور آمرانہ نظام کے خلاف مزاحمت جیسے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹا۔

ستر کی دہائی میں جو افسانہ نگار سامنے آتے ہیں ان میں انتظار حسین، ثقلین نقوی، رشید امجد، خدیجہ مستور، فرخندہ لودھی، صادق حسین، مسعود مفتی، رشید امجد، اختر جمال، آغا سہیل، ابراہیم جلیس، اے حمید، مشرف احمد، رضیہ فصیح احمد وغیرہ کے نام شامل ہیں، جنہوں نے ۷۰ کی دہائی کے تمام عصری حالات افسانوں کے موضوعات میں سمو کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیے تاکہ آئندہ ایسے حالات پیدا نہ ہو جو ملک کو ابتری کی طرف لے جائیں۔

ان افسانہ نگاروں نے خوف اور دہشت کو اپنے اپنے افسانوں میں بیان کیا یا اس خوف کا تعلق بھی ریاستی جبر سے جوڑتے ہیں کبھی مذہبی انتہا پسندی دہشت کا باعث بنی، کبھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے محابہ یلغار نے انسان کو خوفزدہ کیا تو کبھی مادیت پرستی اور سرمایہ دارانہ نظام نے انسانی عظمت کو مالی منفعت کے ڈر سے اخلاقی گراوٹ کا شکار ہونے پر مجبور کیا۔

خالدہ حسین کا افسانہ ''سواری'' دہشت انگیز فضا کی عکاسی کرتا ہے انور سجاد کا افسانہ شہر کے ''عین وسط میں صحرا تھا'' بھی شہر کا منظر نامہ تشکیل دیتا ہے۔ جو خوف و ہراس پھیلا رہا ہے رشید امجد ''لا=؟''، ''ایک گمنام سیاح کی ڈائری کے چند اوراق'' الجھاؤ میں جبر اور خوف کی فضا ہے۔

اسی کی دہائی میں بھی سیاسی، سماجی، تہذیبی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں انہوں نے زندگی کے معنی کو بڑی حد تک بدل دیا۔ نئے مسائل پیدا ہوئے اصل زندگی کی ہماہمتی، سائنسی و صنعتی ترقی اس ترقی کے مقابل انسان کی تحقیر اور ذلت، مائیگی، اعلیٰ قدروں کی شکست و ریخت، طبقاتی کشمکش، مذہبی انتشار جیسے عناصر ہیں جن سے اصلی زندگی متاثر ہے۔ ان تمام مسائل کو اردو افسانے نے اپنے اندر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس دور میں لکھنے والوں میں انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ حسین، مظہر الاسلام، الطاف فاطمہ، اسد محمد خان، مرزا حامد بیگ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے اسلوب میں جدید دور کے انسان کے مسائل کی عکاسی کی۔

نوے کی دہائی اور اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں اردو افسانے میں معاشی و سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنے اپنے افسانوں میں جگہ دی ان کے موضوعات میں ایٹمی دھماکوں سے پیدا ہونے والی صورتحال، جدید ٹیکنالوجی سے پیدا ہونے والے مسائل، خودکش بم دھماکے اور دیگر قدرتی آفات، ۱۹۹۹ء کے مارشل لاء کے اثرات، نائن الیون کے واقعات اور اس کے نتیجے میں ہونے والی جنگوں کے پاکستان پر پڑنے والے اثرات وغیرہ، ان تمام واقعات کو اردو افسانے نے اپنے دامن میں سمیٹا اور پاکستان اس صدی میں چند سیاسی اور نیم مذہبی تحریکوں کی زد میں رہا ان تحریکوں کے بارے میں بھی اردو افسانے میں بیان کیا گیا۔

روزگار اور بہتر زندگی کی تلاش میں دیہاتوں سے شہروں کی طرف آبادی کی منتقلی نے ایک نئے رخ کا روپ اختیار کیا۔ پاکستان کی عوام نے خود کو مالی طور پر مستحکم کرنے کے لیے بیرون ممالک کا رخ کیا کچھ نوجوان اپنے خواب پورا کرنے میں کامیاب بھی ہوئے کچھ ناکام لوٹے۔ ہر دو صورت میں ایسے افراد کو اپنی روایات اور مانوس طرز زندگی، نئی بستیوں کی تہذیبی و سماجی روایات کے درمیان کشمکش کا سامنا کرنا پڑا، جس کی وجہ سے ان کے اندر نفسیاتی اور سماجی مسائل پیدا ہوئے۔ ادھر پسماندہ طبقے کے اپنے مسائل تھے جن سے وہ نبرد آزما تھے۔

اردو افسانے نے غریب طبقے کے افراد کے مسائل سے بھی روگردانی نہیں کی۔ عالمی سطح پر بیسویں صدی گویا نفسانفسی، اقتصادی اور روحانی بحران اور سیاسی تشدد کی صدی تھی۔ اس دور میں علمی ترقی کی رفتار ہولناک حد تک بہتر رہی ہے۔ اس دور میں انسان کی حکمرانی کم ہوتی جارہی تھی اور مشینوں کی عملداری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اخلاقیات، روحانیات اور مادہ پرستی میں جدلیاتی کیفیت تھی۔ ایک طرف مادہ پرستی اور عقل کا دور تھا جب کہ دوسری طرف روحانی اور عقل سے بیزاری کا چرچا تھا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کے لیے آسائشیں پیدا کی اور محیرالعقول کارنامے سرانجام دیئے۔ دوسری طرف مشینوں کی حکومت سے نفرت کا احساس بھی اتنی شدت سے موجود تھا۔ نئے مواصلاتی رابطوں کی بدولت دنیا سمٹ کر عالمی گاؤں بن رہی تھی، دوسری طرف انسان، تعلقات کی سطح پر اجنبیت اور تنہائی کے عذاب میں مبتلا تھا۔ انسان کے پاس اپنوں کو دینے کے لیے وقت بھی نہ تھا، نہ ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کا وقت تھا۔ الفاظ کے معنی اور گفتگو بے روح ہوتی جارہی تھی۔

یہ صدی مارکیٹنگ کی صدی تھی۔ افراد کی ذاتی مارکیٹنگ سے جمہوریت کی اشتہار بازی کی جاتی تھی۔ اس اشتہار بازی نے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو یکسر بدل دیا۔ تفریحات کے انداز بدل گئے، اخلاقی لحاظ سے اپاہج نسلیں جنم لے رہی تھیں۔ مادہ پرستی نے خانگی رشتوں کی اساس، شادی کے نظام پر کاری ضرب لگائی۔ شادی میں مالی منفعت کا اصول پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس صدی میں شہر ''مہانگر'' میں تبدیل ہو رہے ہیں، بڑی بڑی عمارتیں، ٹریفک کی ابتری، ماحولیاتی آلودگی، منظم سمگلنگ، پاکستان میں مارشل لاء، برطانیہ، امریکہ کے ممالک میں مقیم جنوبی ایشیا کے باشندوں کے مسائل وغیرہ کا اردو افسانے پر گہرا اثر پڑ۔ ان تمام حالات و واقعات کے پس منظر میں افسانے لکھے گئے۔ اس دور میں لکھے جانے والے افسانوں پر کئی فلسفوں کا اثر ہوا جن میں وجودیت سرفہرست ہے۔

زندگی کی بے معنویت اور یکسانیت نے آدمی کے احساس کو عصری انسان کی جبلت میں داخل کر دیا تھا، دوسری

طرف تجریدیت اور علامت نے بھی اردو افسانے میں اپنی جگہ بنائی۔اس دور کے افسانہ نگاروں نے نئے تہذیبی اور عصری آشوب کے بیان کے لئے پرانی تہذیبوں اور آسمانوں میں سفر کیا اور تجربے اور مشاہدے کو آج کی عصری صورتحال سے منسلک کرنے کی کوشش کی۔اس دور کے لکھنے والوں میں انتظار حسین، زاہدہ حنا، مظہر الاسلام، منشیاتاد، الطاف فاطمہ، بلراج مین را، آصفی فرخی، احمد داؤد اور مرزا حامد بیگ کے نام نمایاں ہیں۔ان تمام افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے اسلوب میں جدید دور کے انسانوں کے مسائل کی عکاسی کی۔

ج: جاوید انور کا تعارف اور ادبی کوائف:

جاوید انور یکم فروری ۱۹۵۹ کو تحصیل نارووال کے گاؤں مرالی میں پیدا ہوئے۔آپ کی والدہ گرامی کا نام شمیم اختر اور والد کا نام چودھری محمد انور تھا۔جاوید انور ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کا خاندان جاٹ برادری کا ایک درمیانہ زمیندار خاندان ہے۔آپ کے والد نے گریجوایشن کی ہوئی تھی اور تدریس کے شعبے سے منسلک تھے۔آپ کے خاندان میں سب کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور آپ خود بھی اپنے نصاب کے علاوہ بھی کتابیں پڑھتے تھے۔انہیں اپنے ماموں منظور احمد چیمہ کی وجہ سے ادبی مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور وہ ان سے متاثر بھی تھے۔جاوید انور اپنے ایک انٹرویو میں بچپن کا واقعہ یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔

> ''اردو کے استاد مولوی مشتاق صاحب لائبریری کے انچارج تھے اور میں بار بار کتابیں لینے جاتا تھا وہ تنگ آ گئے اور انہوں نے لائبریری کی ایک چابی مجھے دے دیں کہ خود ہی نکال لیا کرو اور پھر رکھ دیا کرو۔''(۷۴)

جاوید انور کم عمری میں ہی سنجیدہ اور خالص ادب کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔آپ نے دس سال کی عمر میں افسانہ نگاروں کو پڑھنا شروع کیا۔آپ نے ابتدائی تعلیم بوبک مرالی گاؤں کے سرکاری سکول سے کی۔وہیں سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول نارووال، سیالکوٹ سے ۱۹۷۲ میں پاس کیا۔ ایف ایس سی کا امتحان گورنمنٹ مرو کالج سے ۱۹۷۵ میں پاس کر کے بی اے میں داخلہ لیا۔آپ کو شروع سے میڈیکل میں دلچسپی نہیں تھی اور اپنے والد کے بے حد اصرار کے باوجود انہوں نے میڈیکل کے شعبے کو چھوڑ کر اسلامیہ کالج سول لائن میں داخلہ لیا اور بی اے کا امتحان ۱۹۷۸ میں اول پوزیشن سے پاس کر کے انگریزی ادبیات میں ماسٹر کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی۔

جاوید انور نے لکھنے کا آغاز اسلامیہ کالج سول لائن سے شروع کر دیا تھا جہاں اردو و فارسی شہرت بخاری پڑھاتے تھے،انہوں نے نثر، غزل اور انشائیہ لکھ کر ان سے رہنمائی لینا شروع کی۔انہوں نے ۱۹۸۷ میں سی ایس ایس کا امتحان دیا اور دسویں کامن کے ساتھ سول سروس امتحان اختیار کی۔سول سروس کے اعلیٰ ترین درجے میں پہنچ کر پاکستان ریلوے میں چیف ایگزیکٹیو آفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔اس ملازمت کے دوران آپ کو چاروں صوبوں میں ملازمت کا موقع ملا آپ نے پاکستان کی ثقافت کے تمام رنگوں کو قریب سے دیکھا فطرت کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن کا مطالعہ بھی کیا۔دوران ملازمت دنیا کے دوسرے ممالک میں جانے کا موقع بھی میسر آیا۔آپ کو پنجابی اردو کے علاوہ انگریزی، امریکی، فارسی، فرانسیسی ادب کے گہرے مطالعے کا موقع بھی میسر

آیا۔ جاوید انور نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا

''میں کسی مجبوری میں نہیں دل سے لکھتا ہوں۔ اپنے ملک کے ہر صوبے میں کافی لمبے عرصے تک رہنا نصیب ہوا، جو ملک میں دیکھا تو وہ لکھتا ہوں۔ جس کا مجھے پتا ہو کہانی میں ڈوب کر لکھتا ہوں، مزے لے کر لکھتا ہوں۔''(۷۵)

آپ کے دو افسانوی مجموعے حال ہی میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ آپ کے افسانوی مجموعے کو قبول عام کی سند مل چکی ہے آپ نے اپنے انٹرویو میں اپنے افسانوں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا

''میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اپنی تحریر جناب اسد محمد خان اور شکیل عادل زادہ جیسی نابغہ روزگار شخصیات کے سامنے پیش کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ انہوں نے کمزوریٔ صحت کے عذر کے باوجود کمال مہربانی اور شفقت سے میرے افسانے پڑھے اور رائے سے نوازا۔ مستند، معروف، نقاد، جناب حمید شاہد صاحب نے فلیپ تحریر فرمایا۔

پروفیسر ڈاکٹر اختر شمار صاحب نے بھی سب افسانے پڑھے اور تعارف تحریر فرمایا۔ معروف و مستند افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، محقق اور نقاد جناب اصغر ندیم سید، معروف و معتبر ناول نگار محمود ظفر اقبال ہاشمی اور میرے پسندیدہ نثر نگار جناب عرفان جاوید نے کمال محبت سے مفصل تنقیدی تحاریر سے نوازا۔ ان اکابرین کا لکھا میری کتاب کے ماتھے کا جھومر اور میرے لیے باعث فخر ہے۔''(۷۶)

تصانیف

''اگر تم لوٹنا چاہو'' جاوید انور کا پہلا شعری مجموعہ ہے، جو ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ۶۲ غزلیات اور ۱۷ نظمیں ہیں۔ اس مجموعے میں چار پنجابی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ اس مجموعے کا انتساب اپنی شریک حیات ڈاکٹر عفت کے نام کیا ہے۔ جاوید انور کا پہلا افسانوی مجموعہ ''برگد'' ۲۰۱۷ء میں ماورا پبلشرز سے شائع ہوا۔ اس کا پہلا ایڈیشن قلیل مدت میں ختم ہو گیا جبکہ دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۷ء میں دوسری مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ جاوید انور کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''سرکتے راستے'' ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔ آپ کا دوسرا شعری مجموعہ ''کئی منظر ادھورے ہیں'' بھی ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا جس میں ۱۷ غزلیں ۹۷ نظمیں اور ۳۶ قطعات شامل ہیں۔ اس مجموعے کا انتساب بھی ڈاکٹر عفت کے نام کیا گیا ہے۔ ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''اے سنو جاگنے والو ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آیا۔

حوالہ جات

۱۔انور سدید، ڈاکٹر، ادب عصری آگہی اور انشائیہ، مشمولہ ادبی زاویے، کل پاکستان اہلم قلم کانفرنس ۱۹۸۳ کے مقالات کا مجموعہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۹۹

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید (مضمون)، مشمولہ اد باور عصری آگہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۴

۳۔ فضیل جعفری، ادب میں عصریت کا مفہوم، مشمولہ ذہن جدید، سہ ماہی مارچ، اپریل، مئی ۱۹۹۱ء، ص ۱۷

۴۔ علی حسنین نقوی، سید، ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۵۹

۵۔انتظار حسین، آخری آدمی، کتابیات، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۲

۶۔انتظار حسین، ہڈیوں کا ڈھانچہ، مشمولہ آخری آدمی، کتابیات، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۴۷

۷۔انتظار حسین، ٹانگیں، مشمولہ آخری آدمی، کتابیات، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۹

۸۔انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ، تحقیق و تنقید، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۸ء، ص ۴۱۲

۹۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۲

۱۰۔انور سجاد، بچھو، غار، نقش، مشمولہ استعارے، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۹

۱۱۔انور سجاد، کونپل، مشمولہ استعارے، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۱

۱۲۔انور سجاد، سازشی، مشمولہ استعارے، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۳۳۷

۱۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۲

۱۴۔خالدہ حسین، آدھی عورت، مشمولہ دروازہ، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۴

۱۵۔خالدہ حسین، میں یہاں ہوں، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۴۷، ۴۶

۱۶۔غلام ثقلین نقوی، سبز پوش، مشمولہ نغمہ و آگ، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۹۶

۱۷۔خدیجہ مستور، ٹھنڈا میٹھا گوشت، مطبوعات، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۳

۱۸۔خدیجہ مستور، راستہ، مشمولہ ٹھنڈا میٹھا گوشت، ص ۶۷

۱۹۔ مسعود مفتی، سپاہی، مشمولہ رنگ سنگ، اقرا اسلام آباد، ۱۹۷۸ء، ص ۱۸، ۱۷

۲۰۔ مسعود مفتی، باغی، مشمولہ ریزے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۴۷ء، ص ۱۲۹

۲۱۔ شہزاد منظر، یوٹوپیا، سیپ ماہنامہ، کراچی، شمارہ نمبر ۲۴، ص ۱۳۰

۲۲۔انتظار حسین، اندھی گلی، مشمولہ شہر افسوس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۹۳

۲۳۔ام عمارہ، بہ گناہی بے گناہی، مشمولہ نقش، ماہنامہ کراچی، شمارہ ۶، ۵، ص ۴۷

۲۴۔غلام محمد، اداسی، مشمولہ انگلیاں ریشم کی، نثری دائرہ پاکستان، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۴۲۔۴۳

۲۵۔اختر جمال، دوسری ہجرت، مشمولہ زرد پتوں کا بند، التحریر، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۴۲
۲۶۔ مسعود اشعر، اپنی اپنی سچائیاں، مشمولہ سارے فسانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۷۵
۲۷۔ مسعود مفتی، نیند، مشمولہ ریزے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۷۴ء، ص ۹۶
۲۸۔ابراہیم جلیس، بانگلہ دیش، (افسانہ) مشمولہ الٹی قبر، مکتبہ جلیس، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۲۳
۲۹۔انتظار حسین، اسیر، مشمولہ کچھوے، مشمولہ مجموعہ انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۵۷۲
۳۰۔انتظار حسین، ہندوستان سے ایک خط، ایضاً، ص ۴۴۱
۳۱۔الطاف فاطمہ، جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۹
۳۲۔ سورین کر کیکارڈ، عقل ایک کسبی ہے، مشمولہ وجودیت، قاضی جاوید، لاہور، نگارشات، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰
۳۳۔ قاضی جاوید، وجودیت، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲
۳۴۔وارث علوی، تیسرے درجے کا مسافر، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۴۷
۳۵۔ سراج منیر، انور سجاد، ایک گفتگو، مشمولہ کہانی کے پانچ رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۲
۳۶۔رشید امجد، شناسائی، دیوار اور تابوت، مشمولہ عام آدمی کے خواب، س۔ن، ص ۲۴۳
۳۷۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، تہذیبوں اور زمانوں میں افسانہ نگار کا سفر، مشمولہ راوی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۰۲
۳۸۔رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب۔ رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۵۷
۳۹۔اعجاز راہی، گواہی (مرتب) عوامی دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۸ء ص ۲
۴۰۔آغا سہیل، پرچم، مشمولہ ماہنامہ فنون، دسمبر، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۹۸
۴۱۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، مشمولہ روزنامہ جنگ، اسلام آباد، سوموار ۷ جولائی ۱۹۹۷ء، ص ج
۴۲۔ ممتاز مفتی، روغنی پتلے، مشمولہ مفتیانے، فیروز سنز، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۹
۴۳۔اشفاق احمد، قصہ نل دمینتی، مشمولہ سفر مینا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۱
۴۴۔ منشایاد، ایک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۷
۴۵۔ مرزا مبین، ہم عصر اردو افسانہ، مشمولہ مکالمہ ۲۰۰۸تا۲۰۰۹، اکادمی بازیافت، کراچی، ص ۳۷۲
۴۶۔افتخار نسیم، پردیسی (افسانہ)، مشمولہ ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، مرتبہ نجیبہ عارف، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۴۷
۴۷۔ نیلوفر اقبال، آپریشن مائنس، مشمولہ محولہ بالا، س۔ن، ص ۱۳۳

۴۸۔حمید شاہد، سورک میں سور، مشمولہ محولا بالا، ص ۱۹۰

۴۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۳۲

۵۰۔فرخ ندیم، کچھ لکھنے سے پہلے، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۶

۵۱۔ایضاً

۵۲۔ایضاً

۵۳۔نجیبہ عارف، (مرتبہ) ۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ (انتخاب و تجزیہ)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۲۶

۵۴۔خالد فتح محمد، اور طرح کی جنگ، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۰۶

۵۵۔زبیدہ ذوالفقار، اردو غزل پر ۱۱/۹ کے اثرات، (مضمون) مشمولہ پاکستانی زبان و ادب پر نائن الیون کے اثرات (مجموعہ مقالات)، ص ۶۷

۵۶۔حامد سراج، کالی دیواریں (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۷

۵۷۔رشید مصباح، خاک زادے (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۷

۵۸۔صبا اکرم، جدید افسانہ، چند صورتیں، زین پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۴۷

۵۹۔رشید مصباح، خاک زادے (افسانہ)، ص ۱۰۹

۶۰۔نور ہدیٰ، پرانے کاغذوں میں (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۲، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۴،، ص ۴۰۔۴۱

۶۱۔نجیبہ عارف، ڈاکٹر (مرتبہ)، ۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ، ص ۴۶

۶۲۔مرزا حامد بیگ، افسانہ کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۵۱

۶۳۔Patrica and Hundly, The Importance of Globalization in higher Education.www.intecheon.com14th February,2019,7:55 pm

۶۴۔ حمیرا اشفاق، جدید اردو فکشن، عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۴

۶۵۔نذیر تبسم، ڈاکٹر، عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات (مضمون)، مطبوعہ ششماہی خیابان، ص ۳۹

۶۶۔انور زاہدی، زحال مست (افسانہ)، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۸، ۲۰۱۳ء، ص ۳۹۔۴۰

۶۷۔عابد میر، کتاب چور کی کہانی (افسانہ) مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۸، ۲۰۱۳ء، ص ۸۴

۶۸۔ محمد الیاس، خاندانی لوگ، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات،، شمارہ ۱۰۹، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۸۸

۶۹۔ سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵

۷۰۔انور زاہدی، پرانے کاغذوں میں افسانہ، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، ۲۰۱۵ء، ص ۴۰
۷۱۔الطاف فاطمہ، مسزین ہیروز سکول (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، ۲۰۱۳ء
۷۲۔خالد فتح محمد، دل کو دل سے راہ (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، ۲۰۱۵ء، ص ۷۷
۷۳۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید افسانہ نگاری کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۵
۷۴۔جاوید انور، نجی گفتگو، ریلوے ہیڈ کوارٹر، لاہور، ۲۴ اپریل ۲۰۱۸ء
۷۵۔ایضاً
۷۶۔ایضاً

باب دوم

جاوید انور کے افسانوں میں سماجی زندگی کی عکاسی

الف:۔ جدید شہری معاشرت اور معاشی مسائل

انگریزی لفظ City کے لیے اردو زبان میں شہر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں یہ لفظ فارسی سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی ہیں:

> ''بڑی آبادی وہ جگہ جہاں بہت سے آدمی مکانات میں رہتے ہوں اور میونسپلٹی، کارپوریشن وغیرہ کے ذریعے انتظام ہوتا ہو۔'' (۱)

شہروں کی تاریخ اگرچہ بہت پرانی ہے لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ سلطنتیں بتدریج بدویت سے حضریت کے مقام تک پہنچتی رہی ہیں۔ ابتدائی شہر ہمیشہ کسی چھوٹے سے گاؤں کی ترقی سے وجود میں آتے رہے۔ گاؤں انسانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی مستقل رہائش کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شہری طرزِ زندگی کا خمیر دیہی زندگی سے اٹھا ہے تو بجا ہو گا۔

انسان کے بڑے گروہوں کے لیے City کا لفظ کب استعمال ہوا اس کو استعمال کرنے کے محرکات کیا تھے اس ضمن میں

> ''City کا لفظ انگریزی میں تیرھویں صدی عیسوی سے موجود ہے لیکن اس کا جدید ترین مفہوم میں استعمال سولہویں صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ انیسویں صدی عیسوی تک یہ لفظ لندن کے لیے مخصوص تھا۔ اسی صدی کے وسط میں صنعتی انقلاب کے بعد بڑی انسانی آبادیوں کے لیے عمومی طور پر یہ لفظ مستعمل ہو گیا۔''(۲)

شہروں کی کچھ نمایاں خصوصیات ہوتی ہیں جن کی بنیاد پر انسانی آبادی کو شہر کا نام دیا جاتا ہے۔ ان خصوصیات کا واضح فرق انسانی معاشروں کی تہذیب و تمدن میں پرکھا جاتا ہے۔ تہذیب و تمدن کے اس فرق سے ہی معاشرہ دو گروہوں میں تقسیم ہوتا نظر آتا ہے۔ جو دیہات اور شہر کہلاتے ہیں۔ دیہات کی زندگی گاؤں سے منسلک ہوتی ہے۔ دیہات انسانی معاشرے کی پرانی تصویر کو ابھارتی ہیں۔ دیہات کا نام سنتے ہی ایک سادہ صاف ستھری سادہ زندگی کا تصور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

دیہات میں لوگ کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس شہر میں صنعت و تجارت کو

زیادہ فروغ ملا۔ جہاں ذرائع آمدورفت کی تمام سہولیات میسر ہوں، وہاں شہری زندگی کا سراغ ملتا ہے۔ کیونکہ شہری اور دیہاتی زندگی کی تقسیم معاشی سطح پر وجود میں آتی ہے۔ شہروں کی جدید زندگی کو صنعت و حرفت کے شعبے سے منسلک کیا جاتا ہے۔ شہر کا اپنا ایک مخصوص تعمیراتی اور سماجی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف بریٹینکا کے مطابق:

> "There are five things that make City fortification, market a lawcode. An association of urben citizenry creating a sense of municipal corporateness and sufficient political autonomy for urban citizens to choose the city governer's."(۳)

اسی طرح wiber اپنی تصنیف "The Nature of City" میں تحریر کرتا ہے

> "Cities are centers of markets. Governments religions and culture."(۴)

شہری زندگی کی ان تعریفوں سے واضح ہوتا ہے کہ شہری زندگی کی ایک الگ ہی پہچان ہے۔ شہروں میں طرز تعمیر جدید طریقوں سے کی جاتی ہے۔ شہروں میں گھر فلیٹ نما کوٹھیوں کی شکل میں اور محلوں اور گلیوں کی بجائے سیکٹر اور بلاک بنے ہوتے ہیں۔ ہر بلاک یا سیکٹر میں ضروریات زندگی کی تمام سہولیات مہیا ہوتی ہیں۔ شہروں میں کھیل کے میدان مثلاً کرکٹ، فٹ بال اسٹیڈیم، مختلف تجارتی مراکز، شاپنگ پلازہ، بڑی بڑی سڑکیں ،موٹروے اور بری و بحری راستے تمام سہولتیں شہریوں کو بڑے شہر میں میسر ہوتی ہیں۔

جہاں شہروں میں اتنی ساری سہولیات میسر ہوتی ہیں۔ وہاں اپنی سہولیات کو حاصل کرنے کے لیے آس پاس کے دیہات کے لوگ شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ اس طرح شہروں میں آبادی کے اضافے سے رہائش کے مسائل نے جنم لیا کیونکہ لوگ دیہاتوں شہروں کی طرح روزگار کی تلاش کے لیے آتے ہیں۔ معاشی مسائل کی وجہ سے یہ لوگ شہروں کے مہنگے فلیٹوں اور گھروں میں پناہ نہیں لے سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ لوگ شہروں کے آس پاس چھوٹی موٹی بستیوں میں رہتے ہیں جس کی وجہ سے اراضی نامہ جیسے مسائل جنم لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشی اور معاشرتی حوالے سے دیکھیں تو بڑے بڑے شہروں میں صنعتیں، فیکٹریاں، کارخانے لگائے جاتے ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک تجارت شہر کے پلیٹ فارم سے ہوتی ہے۔

زیادہ تر شہریوں کا پیشہ صنعت و حرفت سے منسلک ہیں۔Lewis Mefurd اپنی کتاب The Culture Cities میں لکھتے ہیں:

> "The City also involves the internal division of labour which contain persons engaged in manufacturing by machines other buying and selling goods and commoclites." (۵)

شہروں میں جہاں صنعتی مراکز کی بھرمار ملتی ہے وہیں اعلی تعلیمی مراکز کے حوالے سے شہروں کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔یونیورسٹی کے طالب علم اعلی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔یہ طلبہ و طالبات ان اعلی تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر بحثیت ڈاکٹر،انجینئر،پروفیسر،استاد،سرجن کے ملک و قوم کی خدمت کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔اس کے علاوہ شہروں میں ذرائع نقل و حمل کی سہولیات نے لوگوں کے درمیان فاصلوں کو مٹا کر ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔

آج جدید ٹیکنالوجی کے باعث سمندر پار لوگوں سے ملاقات چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جانا یا ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا اب کوئی مشکل کام نہیں رہا۔دنیا نے ایک گلوبل ویلیج کی شکل اختیار کر لی ہے۔

شہروں کا ایک بنیادی عنصر آبادی ہے۔ شہروں میں آبادی دیہات کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے آبادی بڑھتی ہوئی ہے عناصر اور ذرائع کو بھی فروغ ملتا ہے۔بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیداوار میں اضافہ درکار ہوتا ہے۔اس طرح انسان اپنی سہولیات اور ضروریات کے تحت جدید پیداواری طریقوں کو فروغ دیتا ہے۔ جس جگہ پر آبادی ایک خاص تناسب سے بڑھ گئی تو وہاں شہری زندگی کا آغاز ہو گا۔

شہروں میں علوم و فنون،تہذیب و تمدن کو بھی فروغ دیا جاتا ہے۔ مثلا علم موسیقی،مصوری،اداکاری وغیرہ جیسے فنون کو شہروں میں پذیرائی ملتی ہے۔ شہروں میں صنعت و حرفت اور ہاتھ سے بنائی گئی مصنوعات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ شہروں میں دیہات کی نسبت زندگی پر آسائش اور آسان ہے۔ شہر میں شہریوں کو تمام سہولیات باآسانی میسر ہوتی ہیں۔ لیکن شہروں میں بھی بہت سے مسائل ہیں۔ مثلا مہنگائی،بیروزگاری، کثیر آبادی وغیرہ۔انہی مسائل نے شہریوں کو اضطراب اور بے سکونی میں مبتلا کیا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے شہروں میں جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔

i. اردو افسانے میں شہری معاشرت

قیام پاکستان کے بعد اردو افسانے میں تبدیلی کا اہم کردار ۱۹۶۰ء کے بعد کا ہے۔ جس میں افسانے میں تبدیلی جدیدیت کے حوالے سے نئی موضوعات کی صورتمیں سامنے آئی۔ ترقی پسند افسانہ نگار جن کے موضوعات زیادہ تر مزدوروں کسانوں کا استحصال، سرمایہ کاری اور سماجی نابرابری، عورت کا استحصال، طبقاتی کشمکش، ہندو مسلم فسادات ہے کسی اور تنہائی پر مشتمل ہوتے تھے،ان موضوعات پر لکھنے کا رواج آہستہ آہستہ بالکل ختم ہو گیا کیونکہ آزادی کے بعد ہی صورتحال بدلنے لگی۔بقول رشید امجد: ''گذشتہ دس بارہ سالوں میں سماجی، سیاسی اور فکری سطح پر جو تبدیلیاں آئیں انہوں نے زندگی کا سارا ڈھانچہ بدل دیا ہم نئے نئے مسائل سے دوچار ہوئے۔''(۶)

کیونکہ نئے مسائل بے شمار آنے لگے مثلاً اخلاقی اور روحانی اقدار کا زوال، جدید ٹیکنالوجی، مشینوں کے آگے انسانوں کی وقت کا کم ہو جانا،اس کے علاوہ شناخت کا بحران(Identity Crisis) جیسے مسائل، ہجوم میں انسان کا خود کو اکیلا محسوس کرنا،اجتماعی ہجرت جیسے مسائل ، سقوط ڈھاکہ کے بعد پیدا ہونے والی سماجی، معاشرتی مسائل جنہوں نے افسانہ نگاروں کی توجہ کھینچ لی۔ان تمام کے علاوہ اربنائزیشن کی وجہ سے دیہاتوں کے سمٹنے کا مسئلہ جدید افسانے کا موضوع بنا۔ لہذا معاشرے کی ہر آن بدلتی قدروں نے ادب کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ افسانے میں جہاں شروع سے دیہات کا ذکر غالب رہا وہاں آہستہ آہستہ شہر اور اس سے منسلک مسائل کو بھی ادیب نے اپنی تخلیقات میں جگہ دی۔ لیکن جتنا دیہاتی نظام وسیع تھا وہاں شہری نظام اتنا وسیع نہیں تھا۔

لیکن برصغیر میں انگریز کی آمد نے مخصوص شہروں کو مرکزی حیثیت دی کیونکہ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ شہروں کی حیثیت مسلمہ ہے۔اور ان کو صنعتی مراکز میں تبدیل کر دیا اس طرح دیہات جو خام،اجناس کا ذریعہ تھے اور آبادی کے لحاظ سے بھی زیادہ اہمیت کے حامل تھے لیکن اس کے باوجود شہروں کو نظم و ضبط، تدبر و تدبیر کے مراکز کی حیثیت دی گئی۔اس طرح گاؤں کے لوگوں کا رجحان بھی شہروں کی طرف ہوا۔ دیہات سے شہروں کی طرف لوگوں نے اپنی ضروریات کے پیش نظر نقل مکانی شروع کر دی۔اس طرح شہروں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ نقل مکانی کے اس مرحلے نے اردو افسانے کو بالواسطہ متاثر کیا۔

> ''شہر سے دیہات اور دیہات سے شہر کی طرف آمد و رفت فی النفس اس حرکت کی طرف متوجہ کر آتی ہے جس سے تصادم عمل میں آتا ہے۔ اور سینکڑوں نئی کہانیوں کو جنم مل جاتا ہے۔''(۷)

اس لیے شہروں کے حوالے سے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں افسانوی ادب میں بڑے بڑے شہروں کلکتہ،لاہور،یوپی دہلی،امرتسر وغیرہ کی زندگی میں معاشی اور معاشرتی نظام کی عمدہ عکاسی ملتی ہے۔پریم چند،

سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، علامہ راشد الخیری کے افسانوں میں جہاں دیہاتی زندگی کی عکاسی نظر آتی ہے وہاں شہری معاشرہ اور شہری لینڈ اسکیپ کے منظر بھی نظر آتا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کی فضا تخیلاتی ہونے کے باوجود ان کے افسانوں میں شہر کی فضا بھی نظر آتی ہے۔ان کے افسانے ''حکایہ لیلی مجنوں''میں دلی کے ہوٹل، لاہور کے چڑیا گھر کا ذکر ملتا ہے۔''اگر میں صحرا نشین ہوتا''شہروں کے غیر منصفانہ رویوں کو اجاگر کرتا ہے۔''آہ شہر نشین ہوں روتا ہوں اور کہتا ہوں۔''(۸)

اسی طرح منشی پریم چند نے بھی اپنے افسانوں میں دیہات کے موضوع پر زیادہ بات کی ہے۔ لیکن ان کے کچھ افسانوں میں شہری زندگی کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ان کے افسانے عید گاہ، میرا وطن، مس بدمہ، بیوہ کا ایثار، نمک کا داروغہ، گجر کی بیٹی وغیرہ میں شہری معاشرت اور مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے۔دیہات میں جاگیر دانہ نظام نے جہاں دیہات کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا وہیں شہری زندگی میں سرمایہ دارانہ نظام نے شہر کو مختلف طبقات میں بانٹ دیا۔ سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش شہر میں بہت سے مسائل پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

کرشن چندر نے اپنے افسانوی مجموعہ ''سدا بہار پھول'' کے کئی افسانوں میں سرمایہ دارانہ نظام کی مادہ پرست فطرت اور اخلاقی اقدار کے زوال کو موضوع بنایا ہے۔ڈاکٹر عمارہ طارق نے سرمایہ دارانہ نظام کو کرشن چندر کے افسانوں میں اس طرح پایا ہے۔''کرشن چندر کے ہاں شہر کی زندگی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ شہری زندگی کے مسائل پر بھی لکھا گیا مگر زیادہ تر ہر شہر، سرمایہ دارانہ فضا اور اس کا رنگ بیان کیا۔''(۹)

اردو افسانہ ابتدا میں رومانوی اور حقیقت نگاری کے عناصر سے مزین تھا۔ رومانوی افسانوں میں فکری اور ماورائی عناصر پائے جاتے تھے۔ لیکن حقیقت نگاری کے پیش نظر جو افسانے لکھے گئے ان میں دیہات اور شہروں کی تہذیب و ثقافت ماحول کے سماجی و معاشی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ کیونکہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی نت نئی ایجادات نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تو دنیا ایک گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر گئی بھی ایسے میں سرمایہ داری اور مشینی نظام نے پوری دنیا کو بدل کے رکھ دیا، طاقت اور پیسے کا حصول اور مادی ترقی کے لئے لازم و ملزوم ہو گیا، اس طرح ان حالات نے ادیبوں اور شاعروں کو بہت متاثر کیا کیونکہ یہ ایسی صورتحال ہے جو ہر حساس انسان کو متاثر کر سکتی ہے۔ایسے ہی ان حالات نے الطاف فاطمہ کو متاثر کیا۔

الطاف فاطمہ نے ''جشنے دارد'' میں ایک طرف پسماندہ طبقے کو، جو حیوان نما انسانوں جیسی زندگی گزار رہا تھا، کو بیان کیا ہے دوسری طرف اس طبقے کو بیان کیا ہے جو ٹیلی ویژن، ریڈیو، کولر، قالینوں، فریج وغیرہ جیسی آسائشوں میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے کے غریب اور امیر طبقے کی زندگی کو نہایت عمدہ طریقے

سے بیان کرتی ہیں۔الطاف فاطمہ نے پاکستان کے ترقی پذیر معاشرے کے بدلتے ہوئے معاشرتی و سماجی رویوں کو موضوع بنایا۔ورکنگ ویمن کے مسائل انہوں نے ''ننگی مرغیوں''میں بیان کیے۔اسی طرح طرح''ذہنی اقلیدس''،''مہرہ جوپٹ گیا''اور''ایسی لمبی داڑھی''وغیرہ میں بھی بیان کیا ہے۔اسی طرح خالدہ حسین نے بھی شہری زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کو اپنے افسانوی مجموعہ پہچان میں بیان کیا۔ان کے افسانے''ہزار پایہ''،''ہم جنس''،''پہچان''،''سایہ''اور بایاں ہاتھ وغیرہ معاشرے کے اخلاقی اور سماجی رویوں کے زوال کی داستان بیان کرتے ہیں۔''گلی''افسانہ جدید شہری تمدن کے زوال کی تصویر کشی کرتا ہے۔

اسد محمد خان نے جدید عصری صورتحال کو''مرتبان''،''ایک سحری''اور''ذلیل سائنس فکشن''میں بیان کیا۔ان افسانے میں انہوں نے انسان کا کرب،بے بسی،تنہائی،دہشت کو بیان کیا۔جس دور میں انسان کو زندہ رہنے کے لیے بھی قیمت چکانی پڑتی ہے۔قانون کے رکھوالے عزت و جان کے نگہبان بننے کی بجائے لٹیرے بن جاتے ہیں۔اس عہد کے جدید لکھنے والوں میں منشا یاد، آصف فرخی، زاہدہ حنا،مسعود مفتی، شمس الرحمن فاروقی،اقبال مجید،اقبال متین،مسعود ارشد،افتخار نسیم،آغا سہیل،اشفاق احمد وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے اپنے عہد حاضر کے عصری مسائل کو بیان کیا۔اشفاق احمد کے اکثر افسانوں میں اینڈیلزم پایا جاتا ہے۔اس کے باوجود ان کے افسانوں میں طبقاتی اور شہری زندگی کی عکاسی بھی ملتی ہے۔انہوں نے مارکیٹنگ پالیسی،سماجی امتیازات،عدم مساوات، قانونی نظام کی خامیوں اور باریکیوں کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

منشایاد عصر حاضر کے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ باشعور انسان بھی ہیں۔انہوں نے معاشرے کے جدید بدلتی اخلاقیات کو محسوس کیا ہے۔ان کے نزدیک تمام شعبہ ہائے زندگی،چاہے وہ سکول ہو یا عدالت، سرکاری ادارے یا پرائیویٹ ادارے،ہر جگہ نااہل،رشوت خور اور سفارشی لوگ ترقی کرتے چلے جارہے ہیں۔ معاشرے میں پیسے کی اہمیت انسان سے زیادہ ہوگئی ہے،لوگ مادیت پرست ہوگئے ہیں۔ان کے افسانے بانجھ ہوا میں سانس،رکی ہوئی آوازیں، نئی دستک،دنیا کا آخری آدمی اور کہانی رات میں معاشرتی اقدار کی شکست وریخت کو عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔''دنیا کا آخری آدمی''میں انہوں نے جدید بدلتی معاشرتی اقدار کو بیان کیا ہے

> ''گنجائش تو نہیں تھی لیکن آج کل شہر کے اس فیشن علاقے میں رات کو کاروں میں بیٹھ کر کھانا پینا، کھاتے پیتے لوگوں کا دستور ہے۔خود کو اس طبقے میں شامل سمجھنے کے لئے ہمیں بھی یہ دستور نبھانا پڑتا ہے۔''(۱۰)

ٹیکنالوجی کے دور میں مشینوں کے جابجا استعمال نے انسان کو اپنا غلام بنالیا ہے۔منشایاد نے اپنے افسانے

''کوک بھرے کھلونے''میں مشینوں کی حکمرانی کو بیان کیا ہے۔منشایاداپنے افسانوی مجموعہ ''ایک کنکر ٹھہرے ہوئے پانی میں''لکھتے ہیں:''اس کتاب کے زیادہ تر افسانوں میں آپ کو سیاسی، سماجی اور عالمی صورتحال کی جھلک ملے گی۔عمر کے ساتھ ساتھ سفاک انسانی رویوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔''(۱۱)

بانو قدسیہ افسانہ نگاروں میں بھی ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔بانو قدسیہ نے ناول اور افسانے دونوں میں اپنانام کمایا۔بانو قدسیہ کا افسانہ ''ہو نقش اگر باطل''میں غریب طبقہ کی ازدواجی زندگی کی محرومیوں اور نفسیات کی عکاسی کی ہے۔''سوغات''افسانے میں انہوں نے شہری زندگی کی تلخیوں، چالاکیوں کو بیان کیا ہے۔تعلیمی نظام پر طنز کے زمرے میں لکھا گیا افسانہ ''بیوگی کا داغ''میں بانو قدسیہ نے جدید معاشرے میں عورتوں کے بدلتے معیارات واقتدار کو بیان کیا ہے۔یہ افسانہ بدلتے ہوئے سماج پر گہرا طنز ہے۔بانو قدسیہ نے زیادہ تر افسانوں میں معاشرے کے بدلتے ہوئے معیار کی بدولت متوسط گھرانوں میں پیدا ہونے والے مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

آج کے جدید دور میں بھی اردو افسانہ خواہ وہ علامتی ہو یا تجریدی، سادہ بیانیہ انداز میں لکھا جارہا ہے۔دور حاضر کے افسانہ نگار شہر اور شہری زندگی کی تیز رفتار تبدیلیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔کیونکہ آج کی صورتحال میں انسان کی حکمرانی کی بجائے مشینوں کی عملداری زیادہ بڑھ چکی ہے۔سائنس، ٹیکنالوجی، میڈیا نے سماجی اقدار کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ان تمام حالات کے پیش نظر جدید افسانہ نگاروں نے بدلتے ہوئے معاشرتی اصول واقدار کو موضوع بنایا ہے۔ان افسانہ نگاروں میں جاوید انور اردو ادب کی افسانہ نگاری کے فن میں ایک نیا اضافہ ہے۔لیکن ان کا فن اس قدر گہرے مشاہدے اور برجستگی کا حامل ہے کہ وہ معمول سے معمولی واقعہ کو بھی فن پارہ بنانے کے ہنر سے آشنا ہیں۔اس لئے جاوید انور کے افسانوں میں جدید سماجی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔

ii. جاوید انور کے افسانوں میں شہری معاشرت اور معاشی مسائل

جاوید انور نے جدید معاشرے اور ان کے معاشی مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ہر معاشرے میں مختلف مزاج کے لوگ بستے ہیں۔ہر فرد ذہنی اور نفسیاتی طور پر دوسروں سے مختلف ہوتا ہے اس لیے ہر فرد کے سوچنے سمجھنے کے انداز و صلاحیت میں فرق ضرور پایا جاتا ہے۔آج کے دور میں ہر فرد افراتفری کا شکار ہے کیونکہ جدید دور میں جنسی اور اخلاقی رشتوں کی حیثیت بالکل بدل گئی ہے۔ہر انسان مادیت پرستی کی طرف گامزن ہے۔اسی مادیت پرستی کو جہاں عام انسان کو متاثر کیا ہے وہیں شادی کے نظام پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔اگر Marry to earn money! کی اصطلاح استعمال کی جائے تو بجا ہوگا۔آج کے جدید دور میں صرف دو

لوگوں کے درمیان رشتہ ہی نہیں باندھا جاتا بلکہ رشتے کی ایک قیمت بھی چکانی پڑتی ہے۔

مرد کو جدید معاشرے کے تقاضے پورا کرنے کے لیے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اس کے بوجھ کو کم کرے، لیکن اس جدید دور میں عورت معاشرے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر گھریلو فرائض کے علاوہ روزی روٹی کے چکر میں بھی مبتلا نظر آتی ہے۔ کیونکہ عورت کو باوقار زندگی گزارنے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے۔ آج کے دور میں عورت کے باہر کام کرنے کو باعث عار نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن متوسط طبقے میں جہاں عورت نان ونفقے کی ذمہ داریاں لیتی ہے، وہیں مرد خود کو طاقت کا سرچشمہ سمجھ کر اپنی ذمہ داریوں سے نگاہ پھیر لیتا ہے۔ اور خود کو گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد کرتے ہوئے عورت کے ناتواں کندھے پر ڈال دیتا ہے۔ آج کے جدید دور میں بھی عورت اپنے حق کے لیے آواز بلند نہیں کر سکتی۔ جاوید انور کے افسانے ''شیر'' میں یہی چیز کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے: ''یہ جھگی والوں کو ہدایت تھی کہ عورتیں کمائیں، بچے پیدا کریں اور مرد سوتے رہیں۔ صبح دیر سے اٹھ کر ناشتہ کر کے نہا دھو کر مونچھوں کو تیل لگا کر ریڈیو پر گانے سنیں۔''(۱۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نچلے طبقے میں عورت کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ مرد خود کو طاقت کا سرچشمہ سمجھ کر خود کو تمام ذمہ داریوں سے آزاد کرتا ہے۔ جاوید انور نے ان مسائل کو اجاگر کیا، جہاں عورتوں غربت کی لکیر سے نیچے رہ کر اس طبقہ میں اکیلی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہے۔

آج کے جدید معاشرے میں سماجی، سیاسی اور فکری سطح پر بہت نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ رہن سہن کے طریقے بدلے ہیں جب کہ جینے کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ انسان فطری طور پر تبدیل ہوا ہے۔ اس تبدیلی نے انسان کو فکری طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس تبدیلی نے نچلے طبقے کو بھی متاثر کیا ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں جدید ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کی زندگی میں آسانیاں لائی ہیں وہیں بہت سے مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ انسان کو جدید دور میں بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بہت تگ ودو کرنی پڑتی ہے۔ اس دور کی جدوجہد میں مرد کے ساتھ ساتھ عورت بھی شامل ہے۔ معاشرے میں عورت کے باہر کام کرنے کو عام سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ صرف ہمارے اعلی یا متوسط طبقے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمارے معاشرے کا نچلا طبقہ جو غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ آج کے دور میں بھی عورت مرد کے تسلط کا شکار ہے۔ اس طبقے کی عورت گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ نان ونفقہ کی بھی ذمہ دار ہے اور مرد مزے لیتے رہتے ہیں۔ اس طبقے میں عورت ظلم کی چکی میں پستی ہے جبکہ مرد عیاشی کی زندگی گزار رہا ہوتا ہے اور بے فکرا نظر آتا ہے۔ جاوید انور نے اپنے افسانے ''شیر'' میں اس بات کو یوں بیان کیا ہے۔ ''دونوں کمائیں گے تو بات ہی اور ہو گی ابھی

سجن سہیلیوں، سکھی سہیلیوں سے، اڑوس پڑوس سے آگے نکل جائیں گے اور ہماری اولاد ہم سے آگے۔"(۱۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کے معاشرے میں عورت باوقار زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ وہ آگے بڑھنے، ترقی کرنے کی خواہش رکھتی ہے کیونکہ جدید ٹیکنالوجی کے دور میں اس کو آگے بڑھنے کے لئے کام کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اپنے شوہر کو اچھی زندگی گزارنے کے خواب دکھاتی ہے تاکہ وہ بھی اس کے ساتھ کام کرے۔

جدید صنعت و حرفت کے اس دور میں ہر انسان اس بات سے آگاہ ہے کہ بڑھتی ضروریات اور جدید معاشرے کے ساتھ چلنے کے لیے مرد اور عورت کو شانہ بشانہ کام کرنا ہوگا لیکن نچلے طبقے کا مرد اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ معاشرے میں اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال کے عیاشی کی دنیا میں مگن نظر آتا ہے۔ اس سوچ کو جاوید انور نے اپنے افسانے "شیر" میں اس طرح بیان کیا ہے: "اس فلم والی میم نے دکھایا کہ شیر جنگل کا بادشاہ طاقتور ہو کے بھی کچھ نہیں کرتا۔ نہ شکار نہ کوئی محنت، بس شیرنی کے ساتھ مزے کرتا ہے۔"(۱۴)

جدید معاشرت نے جہاں انسانوں کی ضروریات میں اضافہ کیا، وہیں لوگوں کے اندر شعور بھی بیدار کیا ہے۔ کہ وہ دوسروں کا خیال کریں۔ اس طرح شہری زندگی نے انسان کو سوچنے سمجھنے کا شعور بھی دیا۔

خدمت خلق اور انسانی فلاح و بہبود کا تصور تمام دنیا کے مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ اسلام میں بھی خدمت خلق پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی نے انسان کو اس دنیا میں خدمت خلق کے لئے بھیجا ہے۔ اللہ تعالی قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ ایک انسان کی جان بچانا ساری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ہے جبکہ ایک انسان کی جان لینا ساری انسانیت کی جان لینے کے مترادف ہے۔ اسی طرح حدیث مبارکہ میں ہے کہ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جس کے وسائل محدود ہیں۔ ہمارے معاشرے میں نچلے طبقے میں ۷۰ فیصد سے زائد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ عام طبقہ کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نجی اداروں کا وجود عمل میں آیا ہے جس میں لوگوں کی امداد سے یہ ادارے چلائے گئے ہیں تاکہ ان لوگوں کی امداد کر کے اس طبقے کو اس گرداب سے نکالا جائے اور ان میں نئی امنگ پیدا کی جائے۔

ان کی تعلیمی و سماجی طور پر تربیت، صحت، غربت و افلاس سے نکالنے کی کوشش کے لیے ان کی مالی معاونت کے ساتھ ان کے بچوں کو والدین کی رضامندی سے سکول کی اجازت بھی ان اداروں کے کاموں میں شامل ہے۔ ادارے ملک و قوم کی ترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح جاوید انور نے بھی اسی طبقے کی

نمائندگی کرتے ہوئے برگد کے ایک افسانے شیر میں لکھا ہے۔

''جلد ہی فلاحی تنظیم نے جھونپڑیوں کے پاس خالی پڑی زمین مالک سے کرائے پر حاصل کر کے ایک چھوٹا سا اسکول قائم کر دیا۔ لڑکیوں کے لئے دو استانیاں جبکہ لڑکوں کے لئے دو استاد رکھ لئے۔ خاطر خواہ تعداد میں بچے نہ داخل ہوئے تو فلاحی تنظیم نے ایک چھوٹی سی رقم فی بچہ وظیفہ کے طور پر مقرر کر دی جس کے لالچ اور مجبوری میں والدین نے کافی تعداد میں بچے سکول بھیجنا شروع کر دیئے۔''(۱۵)

ایسے میں یہ فلاحی ادارے والدین میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا شعور پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں جو ملک و قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ متوسط طبقہ کے والدین میں بچوں کی جدید تعلیم و تربیت کا شعور اجاگر کیا۔ جب نچلے طبقے کے لوگ پڑھ لکھ جاتے ہیں تو معاشرے کے فعال کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کے اندر زندگی گزارنے کی امنگ جنم لیتی ہے محنت کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ اس خیال کو اپنے کردار کی سوچ کے ذریعے اس طرح بیان کرتے ہیں ''اب ہم پڑھ گئے ہیں ہمیں سارا بوجھ مل کر اٹھانا چاہیے۔''(۱۶)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسو کردار جو فلاحی تنظیم کے سکول سے تعلیم حاصل کر کے پڑھ لکھ جاتی ہے اس میں نئی سوچ پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے شوہر مانا سے کہتی ہے ہم پڑھے لکھے ہیں ہمیں مل کر کام کرنا چاہیے۔ زندگی کی ضروریات کے بوجھ کو مل کر کم کرنا چاہیے۔ جدید تعلیم دونوں کو ایک نئی سوچ دیتی ہے۔ وہ محنت پر یقین رکھتے ہوئے مانگ کر کھانے کی بجائے کام کرنے کو ترجیح دیتی ہے۔

سماجِ انسانی کی روح اگر عورت کو کہا جائے تو بجا ہو گا۔ کیونکہ انسانی ارتقاء میں خاندان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ کسی بھی خاندان کی اصل بنیاد عورت ہے جو انسانوں کے جنم کا وسیلہ ہوتی ہے۔ خاندان کو قبیلوں اور نسلوں میں بدل دیتی ہے۔ کوئی بھی معاشرہ عورت کے وجود کے بغیر نامکمل ہے۔ اس لیے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ عورت معاشرتی بقا کے لیے اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے جتنا کے ایک مرد، لیکن آج کے اس دور میں بھی عورت کو وہ مقام و مرتبہ حیثیت اور اہمیت نہیں دی جا رہی جس کی وہ حقدار ہے۔ بعض نچلے اور وحشی طبقوں میں آج بھی عورت کا استحصال کیا جاتا ہے۔ عورت کے وجود کی نفی کر کے اس کی عزت نفس کو مجروح کیا جاتا ہے ۔ عورت مرد کے تسلط سے مکمل طور پر آزاد نہیں۔ وہ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ معاشی حالات کو بہتر کرنے کے لیے جنسی و جبلی ضروریات پورا کرنے کی ذمہ دار بھی ہوتی ہے۔ وہ خاندان کی معاشی و سماجی نگہداشت کی خاطر اپنی ذات سے لاپرواہ ہو جاتی ہے۔ دو محاذوں پر بیک وقت لڑ رہی ہوتی ہے۔ وہ دوہری ذمہ داریوں کے دو

پاٹوں کے بیچ بلکہ گیہوں کی طرح پس رہی ہوتی ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں۔

''یہ کہنا صحیح نہیں کہ عورت کی اپنی شخصیت ختم ہو گئی،اس نے خود کو مرد کی ذات میں ضم کر دیا نہیں۔اس کی اپنی ذات اور وجود برقرار رہتا ہے مگر چھپا ہوا، کئی تہوں کے نیچے تھے، وہ مرد کی بنائی ہوئی روایات اور اداروں کے درمیان کھوئی ہوئی اور گمشدہ ذات ہے۔''(۱۷)

عورت کے استحصال کو جاوید انور نے افسانے ''شیر''میں اس طرح بیان کیا۔

''سارا دن مزدوری سے جسم اور روح تڑوا کر عورتیں ابھی شام کو گھر کے کام کرتی اور مردوں سے مار کھاتی تھی تھی۔اب بھی سارا دن مزے سے گزار کر مرد رات کو سالن کی بھری پلیٹ اور گرم روٹی کے پہلے حقدار ٹھہرتے تھے۔''(۱۸)

اس اقتباس سے جاوید انور عورت کی بے بسی کو بیان کرتے ہیں کہ نچلے طبقے کا مرد آج بھی عورت کا استحصال کا موجب بن رہا ہے۔ وہ عورت کو اس کا اصل مقام نہیں دیتا۔ عورت مشین کی طرح پورا دن کام کرتی ہے، شام کو گھریلو فرائض انجام دینا بھی اس کی ذمہ داری میں شامل ہوتا ہے۔ مرد خود کو طاقت کا سرچشمہ سمجھ کر عورت پر رعب جھاڑتا ہے۔اس کے حقوق کی پامالی کرنا اس کے نزدیک عام بات ہے شام کا سکون بھی اس کو میسر نہیں ہوتا۔ وہ بچوں اور مردوں سے بچا ہوا کھانا کھا کے سو جاتی ہے۔ سکون نام کی چیز اس کو کبھی نصیب نہیں ہوتی ۔اسی طرح خالدہ حسین نے بھی ''دشمن''افسانے میں ورکنگ وومن کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے:

''میں تو ایک مصروف عورت ہوں جس کے پاس پیسے کی بھی فراوانی نہیں، جو رات کو دن بھر کے کاموں سے تھک ہار کر بستر میں لیٹ جاتی ہے۔ جس کے دل میں زندگی کے بہترین وسائل کی خواہش ہے۔''(۱۹)

اس اقتباس میں خالدہ حسین نے بھی عورت کی بے بسی کو بیان کیا ہے جو زندگی کی ادھوری خواہشات کے ساتھ جی رہی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے اندر اچھی زندگی کی خواہش ختم نہیں ہوتی۔اسی طرح آج کے جدید معاشرت میں عورت کے استحصال کے نت نئے طریقے بھی سامنے آرہے ہیں جس میں عورت کو سرمائے کے حصول کا ذریعہ سمجھا جانے لگا ہے۔ آج کی عورت زیادہ غیر محفوظ ہے، جدید معاشروں میں جہاں آزادی نسواں اپنے عروج پر ہے وہاں آج عورت خود کو پہلے سے زیادہ غیر محفوظ سمجھتی ہے۔ کیونکہ عورت کو جو آزادی دی گئی ہے اس نے اس کی نسوانیت کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ عورت کو اس کا اصل مقام و مرتبہ نہیں دیا گیا، عورت کو کاروباری آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے، آج کا ہمارا معاشرہ قبیح راستوں پر گامزن ہے۔اس چیز کو جاوید انور اپنے

افسانے ''دشت وحشت''میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''سر جی اس گاڑی کی اصلی رونق تو یہ سمگلنگ کرنے والی عورتیں ہیں۔ ویزا لگوانے، سفر کرنے، ادھر جانے، واپس آنے تک مزے ہی مزے، سب کے مزے ہیں۔ سر جی۔''(۲۰)

مبارک علی اپنی کتاب ''عورت اور تاریخ''میں اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

''تاریخ میں عورت کا جو مجموعی تاثر بنتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی اپنی علیحدہ ذات نہیں۔ وہ تاریخ میں محض ایک شے کی مانند ہے کہ جسے مرد نے اپنی خواہشات اور مفادات کے تحت استعمال کیا ہے۔''(۲۱)

جاوید انوا یک اور جگہ ''دشت و وحشت''میں کہتے ہیں۔

''صاحب اس کام میں بڑی خواری ہے۔ گھر سے قدم نکالنے سے لے کر واپس گھر جانے تک جو ملے گا ہر ایک بس ایک ہی نظر سے دیکھے گا، ایک ہی تقاضا کرے گا، ایک چھوڑے گا دوسرا پکڑ لے گا۔''(۲۲)

اس اقتباس میں ایک عورت ریلوے افسر کو بتاتی ہے کہ عورت گھر سے باہر نکلتی ہے اس کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کے جدید معاشرے میں عورت نمود و نمائش کا ذریعہ سمجھی جانے لگی ہے۔ عورت کا جو اصل مقام اور حیثیت ہوتی ہے معاشرہ اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ کہنے کو تو عورت آزاد ہے لیکن عورت کو اس کے حقوق نہیں دیے جاتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے بھی اپنے ناول ''راجہ گدھ''میں عورت کا استحصال دکھایا ہے کہ کس طرح معاشرے کے گدھ عورت کو نوچتے ہیں۔ آج کے دور میں بھی معاشرے کے درندے عورت کو نوچنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں جب خدا کسی غریب سے ناراض ہو جاتا ہے تو اسے خوبصورت بیٹی عطا کرتا ہے کیونکہ آج کا جدید معاشرہ شرم و حیا سے عاری ہوتا ہے اور جدید دور کی چمک نے ہمیں اخلاقیات کے تمام سبق بھلا دیئے ہیں۔

اسی طرح جاوید انور اپنے افسانے ''پیر شناس''میں اپنے کردار شازیہ کے ذریعے مردوں کی نفسیات پر بات کرتے ہیں۔ مرد چاہے عمر کے جس حصے میں بھی ہو وہ عورت کا استحصال کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ وہ عورت کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کی کمزوریوں کو استعمال کر کے اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کے جدید دور میں شازیہ دو بڈوں کی نفسیات بیان کرتی ہے کہ جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی

ہے وہ خود کو جوان ثابت کرنے کے لیے اوچھی اور گھٹیا حرکتیں کرتا ہے۔ اسی لیے مخالف جنس ان کے قریب نہیں آتی۔ ''جو مزید بڈھے ہوتے ہیں خبیث تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ معدوم ہوتی مردانگی انہیں اکساتی ہے کہ وہ اوچھی گھٹیا حرکتیں کریں۔ عام زبان میں کہیں تو چولیں مارے۔''(۲۳)

دوسری قسم کے بڈوں کے بارے میں وہ بتاتی ہے کہ وہ ایسے بڈھے ہیں جو کسی کی مجبوری و بے کسی پر آنکھیں نیم وا کیے ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ ان میں بیوروکریٹ، سیٹھ، مدیر، مشیر، زمیندار وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ یہ ایسے بڈھے ہوتے ہیں جو کمزوروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی طاق میں رہتے ہیں۔ جیسا کہ جاوید انور نے کہا۔

> ''کہیں دانشور تو کہیں نقاد، کہیں سفیر، بیوروکریٹ تو کہیں سیٹھ، کہیں مدیر کہیں مشیر کہیں پیر تو کہیں زمیندار، یہ اپنا جال پھیلائے بگلا بھگت بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ کسی بھی علمی، نفسیاتی، مالی، معاشرتی معاملے میں زیردست کو زیر اثر لا کر مطلب براری کرتے ہیں۔''(۲۴)

آج کے دور میں اخلاقیات کا تصور بدلنے لگا ہے۔ ریاکاری انسانوں میں سرایت کر گئی ہے۔ انسان کے سوچنے سمجھنے کا انداز بدلنے لگا ہے۔ معاشرہ مفاد پرست شکل اختیار کر گیا ہے۔ انسان کے بجائے پیسے کی اہمیت بڑھنے لگی ہے کیونکہ بدلتے ہوئے جدید دور نے انسان کو مفاد پرست بنا دیا ہے۔ انسان اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تگ و دو میں اس حد تک مصروف ہو گیا ہے کہ اس کو یہ احساس ہی نہیں کہ وہ لاحاصلی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ مادیت پرستی نے انسان کو خاندانی نظام، محبت، ہمدردی اور تعلق کے احساس سے محروم کر دیا ہے۔ اس کے فکر و خیال کو بھی متاثر کیا ہے۔ آج کی عورت کل کی عورت سے اپنے فیصلوں میں آزاد نظر آتی ہے۔ آج کی عورت پیار، محبت کے جذبے سے متاثر نہیں ہوتی وہ اپنے بہتر مستقبل کو مد نظر رکھتے ہوئے اقلیت کی کسوٹی پر سوچتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج کے انسان کے دل میں بھی دماغ ہے تو کافی حد تک ٹھیک ہو گا۔ اس خیال کو جاوید انور نے ''برگد'' کے افسانے ''نظر بد'' میں اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''زندگی ایک حقیقت کا نام ہے۔ جسم اور روح کی جنگ میں جسم حقیقت ہے جو سامنے کھڑا ہے اور روح احساس ہے۔ جو خود کو محسوس تو کرواتی ہے لیکن نظر نہیں آتی اگر تم مجھے مادہ پرست بھی سمجھو تو سمجھ سکتے ہو لیکن سچ یہی ہے جو میں بول رہی ہوں۔ میں نے بڑے بڑے فنکاروں اور شاعروں مصوروں کو زندگی کے مکروہ ننگے پن میں بے بسی اور بے لباس دیکھا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں رومانس کے فانی اور خیالی جھولنے کی بجائے حقیقت کے سپاٹ، سیدھے اور مستحکم میدان میں پکے پیروں اتروں گی۔''(۲۵)

اس اقتباس سے عورت کی وہ سوچ سامنے آتی ہے جو زندگی کی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر اپنا فیصلہ سناتی ہے وہ محبت، پیار جیسے رومانوی جذبے سے بالاتر ہو کر عاشر کو اپنا فیصلہ سناتی ہے۔ وہ اپنے فیصلے کو اقلیت کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ وہ مادیت کے دور میں خوشحال اور سہولت پسندی کی زندگی کا انتخاب کرتی ہے۔ اس کے نزدیک عاشر کی محبت بے معنی ہوتی ہے کیونکہ عاشر مڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ عروج کے خیال میں خالی خولی رومانویت کے سہارے زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ اس کے نزدیک پیسہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے، یہ آج کے دور کی ایک تلخ حقیقت ہے۔

اقلیت کی کسوٹی پر فیصلہ کرنا جدید دور کی ضرورت ہے لیکن یہ اقلیت انسان کو لاحاصلی کا شکار کر دیتی ہے۔ انسان زبان، روح اور احساس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کو اپنے اصل کی طرف لوٹنا ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک فطری عمل ہے۔ آج کے جدید دور میں انسان کی مادی حماقت نے اس سے آسودگی چھین لی ہے۔ انسان جتنا مادہ پرستی کا شکار ہوتا ہے، وہ اتنا ہی بے سکونی کا شکار ہوتا چلا جارہا ہے۔ جاوید انور نے اس کو اپنے افسانے ''نظر بد'' میں یوں بیان کیا ہے۔

> ''بس عروج کا ہیولی میرا منتظر تھا جس سے روح اور زندگی بچھڑ چکی تھی۔ ایک بنا سنوارا خالی وجود میرا منتظر تھا۔ جسے دیکھ کر مجھے بے اختیار وہ بے جان مجسم یاد آگئے جو مہنگے ملبوسات اور زیورات کی دکانوں میں سجے دکھتے ہیں۔''(۲۶)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عروج جو جدید معاشرے کو سامنے رکھتے ہوئے اقلیت کی کسوٹی پر اپنا فیصلہ سناتی ہے وہ زندگی کی تمام آسائشیں تو حاصل کر لیتی ہے لیکن مادیت پرستی نے اس سے زندگی کا حقیقی سکون اور آسودگی چھین لی ہے۔ اس کے پاس قیمتی زیورات اور کپڑے تو ہوتے ہیں لیکن اس کی شخصیت کا اعتماد، بے نیازی، مادیت پرستی میں کھو چکی ہوتی ہے۔ اس طرح جدید معاشرے نے جہاں انسان کی سوچ اور فکر کو بدلا ہے وہیں انسان کے باقی معاملات کو بھی متاثر کیا ہے۔ لوگوں میں آگہی پیدا ہوئی ہے، وہ بہتر مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے ہیں، لوگوں میں آگے بڑھنے کی خواہشات نے جنم لینا شروع کیا ہے۔ وہ لوگ جو قصبوں یا چھوٹے شہروں میں رہتے ہیں ان کا بڑے شہروں کی طرف آنے کا رجحان پیدا ہونے لگا ہے۔ چھوٹے شہروں میں کالج یا یونیورسٹی نہیں ہوتی، بچوں کو اچھی اور اعلی تعلیم دلوانے کے لیے دیہات کے لوگوں نے اپنے بچوں کو شہروں کی طرف بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ جدید دور میں اعلی تعلیم جدید معاشرے کی ضرورت اور معیار بن گئی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی سوچ کو بھی جدید معاشرتی و سماجی ضرورتوں نے بدلا تاکہ ان کے بچے بھی جدید معاشرے کے

تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال سکیں اور بہتر معیار زندگی بسر کر سکیں۔ جاوید انور کے افسانے ''نظر بد'' میں اس سوچ کا اظہار ان الفاظ میں ہوتا ہے:

''دونوں متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چھوٹے شہروں یا زیادہ بہتر طور پر کہوں تو قصبات سے بڑے شہر پڑھنے آئے تھے۔ دونوں کے خاندان مالی طور پر اتنے مستحکم تھے کہ ہمیں اچھے تعلیمی اداروں کے ہاسٹل میں آسودگی سے رکھ سکتے تھے۔''(۲۷)

اس حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متوسط خاندان جو تھوڑے سے خود مختار ہیں، جن کی معاشی حالت تھوڑی اچھی ہے وہ اپنے بچوں کو بڑے شہروں کے اچھے تعلیمی اداروں میں بھیجتے ہیں تاکہ وہ جدید تعلیمی مراعات سے استفادہ کر سکیں۔ یہ چیز آج کے جدید شہری معاشرت کی ضرورت کے ساتھ ساتھ فیشن بھی بن چکی ہے۔ اسی طرح عورت جب اس سرمایہ دارانہ اور صنعتی دور میں خود مختار اور آزاد ہوتی ہے، وہ اپنی زندگی کے فیصلے کسی جذباتی دباؤ میں نہیں کرتی ہے کیونکہ وہ جدید معاشرتی مفادات کو سامنے رکھتی ہے۔ عورت میں خود اعتمادی ، بے باک پن بھی عصری معاشرے کی دین ہے۔ یہ رویہ آج کی جدید تعلیم یافتہ خواتین میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس رویے کو افسانے ''غرض'' میں ان الفاظ میں اجاگر کیا گیا ہے

''مجھے لگتا ہے تم اپنے وقتی جذبے اور جذباتی فیصلے بھول جاؤ گے اور محبت کی ابتدائی طغیانیوں کے بعد پھر اپنے اسی پایاب گدلے اور متعفن تالاب میں جا کھڑے ہو گے۔ جس کے تم عادی ہو۔ میں کوئی تنگ ذہن یا جذباتی لڑکی نہیں کہ تمہارے قطعی وقتی اور سطحی جبلی تقاضوں کے زیر اثر پروان چڑھتے غیر معتدل جذبوں کے طوفان میں خود کو غرق کر دوں۔''(۲۸)

اس اقتباس میں عمدہ انداز میں جدید عورت کے رویے کی عکاسی ملتی ہے۔ افسانے میں فریدہ جو الٹرا ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، جو جدید تعلیمی اداروں کی پڑھی لکھی بااعتماد لڑکی ہے، وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتی ہے جبکہ عاشر درمیانی طبقے کا فرد ہے جو اپنے جذبات و خیالات کا اظہار فریدہ سے کرتا ہے لیکن فریدہ اس کو حقیقت سے روشناس کراتی ہے کہ تمہاری محبت کے سطحی جذبوں سے میں متاثر نہیں ہوں یہاں فریدہ جدید معاشرتی رویے کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں رومانویت کے جذبات کوئی معنی نہیں رکھتے ہیں۔ لوگ اپنی زندگیوں کے فیصلے سوچ سمجھ کر رومانوی جذبات سے بالاتر ہو کر کرتے ہیں۔ اس مادیت پرست معاشرے میں پریکٹیکل ہو کر سوچنا آج کی اہم ضرورت ہے۔

اسی طرح آج کے عصری دور میں تعلیمی نظام پیچیدہ سے پیچیدہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جدید معاشرے میں

بچوں کو شہروں کے مہنگے اسکولوں میں پڑھانا عام تصور کیا جاتا ہے کیونکہ آج کل جتنا مہنگا سکول ہو گا اس کو اتنا ہی اچھا سکول گردانا جائے گا۔ انگریزی اور پرائیویٹ سکول میں والدین کا بچوں کو پڑھانا عصری دور کی ضرورت بن چکا ہے۔

> ''اللہ نے تین بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا جو شہروں کے بہترین انگریزی سکولوں میں داخل کروائے گئے اور گاڑیوں میں برق وردی والا ڈرائیور، گن مین ان کے ساتھ بچوں کو سکول چھوڑنے جاتا، دنیا کی ہر نعمت ایک فون کال یا وٹس ایپ میسج کی دوری پر رہ گئی۔''(۲۹)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید دور میں بچوں کو فل پروٹوکول میں ڈرائیور اور گن مین کے ساتھ اسکول بھیجا جاتا ہے کیونکہ انگریزی اسکولوں میں اعلی طبقے کے بچوں کا ایک خاص معیار ہوتا ہے جس سے نیچے وہ آنے کا نہیں سوچ سکتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی سہولت نے ہر شے کی دستیابی کو آسان بنا دیا ہے۔ اس چیز نے اس دور میں بچوں کے اندر سہل پسندی بھی پیدا کر دی ہے۔

جدید ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کو ترقی یافتہ دور میں شامل کر دیا ہے۔ یہ جدید سماجی زندگی کا اہم حصہ بھی ہے۔ جدید سائنس کی نئی نئی ایجادات نے انسانی زندگی کو بے پناہ آسودگی آرام اور سہولیات سے نوازا ہے۔ دور حاضر میں مہینوں کا کام دنوں اور گھنٹوں میں ہونے لگا ہے، مشکل کام آسان اور جلدی ہونے لگے ہیں کیونکہ جدید ٹیکنالوجی نے انسان کو سوشل بنا دیا ہے انسانی تعلقات کا دائرہ وسیع ہونے لگا ہے۔ آن لائن سوشل نیٹ ورکنگ نے انسانی زندگی کو ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا ہے جس نے نوجوان نسل کو آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا ہے۔ سوشل نیٹ ورکنگ کا لفظ جب بھی سننے میں آتا ہے پہلی چیز جو ذہن میں آتی ہے وہ فیس بک ہے۔ ویسے تو سوشل نیٹ ورکنگ بہت وسیع ہے لیکن فیس بک ایک ایسا سوشل میڈیا ہے جس کو بچوں سے لے کر بوڑھے تک استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ اس نے انسان کی ذاتی معاشی سیاسی اور ادبی زندگی پر کافی اثرات مرتب کئے ہیں۔

سوشل میڈیا نے جہاں مثبت اثرات مرتب کیے ہیں وہیں ہماری نوجوان نسل میں صنفی رجحان کو بھی فروغ دیا ہے۔ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا گلوبل ویلج بن گئی ہے۔ اس کی بدولت کامیاب انقلابی سماج برپا کیا جا سکتا ہے لیکن ہماری نوجوان نسل نے اس کا بے جا استعمال کر کے منفی اثرات کو زیادہ ہوا دی ہے۔ آج کا نوجوان اپنے اصل مقصد کو بھول کر اپنا قیمتی وقت فیس بک پر ضائع کر دیتا ہے ہر کوئی ایک فضول سی مصروفیات میں نظر آتا ہے۔ یہ بڑھتا ہوا مصروفیت کا رجحان انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی مرہون منت ہے آج کے دور میں گھر کے جتنے بھی افراد ہیں وہ سوشل میڈیا سے منسلک ہیں وہ اپنا زیادہ تر وقت فیس بک فرینڈز کے ساتھ گفتگو میں

صرف کر دیتے ہیں۔اس سوشل نیٹ ورکنگ نے جہاں دنیا کے فاصلوں کو سمیٹا ہے،وہیں گھر میں موجود افراد کے درمیان اجنبیت پیدا کر دی ہے۔کسی کے پاس اپنے ارد گرد موجود لوگوں کے پاس بیٹھنے یا بات کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔وہ لوگ جو حقیقی زندگی میں زیادہ سوشل نہیں ہوتے ان کے بھی فیس بک پر ہزاروں دوست ہوتے ہیں۔

اس طرح فیس بک پر جو دوست بنائے جاتے ہیں ان سے آمنا سامنا نہیں ہوتا،اس کے ذریعہ بننے والے دوست ہمیشہ اجنبی رہتے ہیں۔فیس بک کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کو دھوکہ بھی دے رہے ہوتے ہیں۔خاص کر نوجوان فیک آئی ڈیز بنا کر اپنے ہی ہم جنس کو دھوکا دینے میں مصروف ہوتے ہیں۔کچھ لوگ اپنی جنسی تسکین کے لئے آن لائن سماجی تعلقات بنا رہے ہوتے ہیں۔جاوید انور نے اپنے ملک میں انٹرنیٹ کے دور میں سوشل میڈیا کی وجہ سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کیا ہے۔اس افسانے میں ایک فیک اکاؤنٹ کے ذریعے کی جانے والی دوستی جس کے بارے میں معلوم بھی ہوتا ہے کہ وہ فیک ہے پھر بھی اس کو دوستوں کی لسٹ میں شامل کر لیا جاتا ہے۔آج کا انسان سوشل میڈیا پر دوستی کرنے اور باتیں کرنے کے خبط میں مبتلا نظر آتا ہے۔''مجھے شروع ہی سے شک تھا کہ وہ فیک ہے لیکن اس کی باتیں انتہائی پر مغز دلچسپ اور دلفریب ہوتی تھیں۔''(۳۰)

اس طرح آج کے عصری دور میں سوشل میڈیا پر بننے والے دوستوں سے لوگ اپنے مسائل زیادہ ڈسکس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ لوگوں کا زیادہ وقت آن لائن فرینڈز کے ساتھ گزر رہا ہوتا ہے۔وہ اپنے تمام ادبی معاشرتی جنسی مسائل پر بلا خوف و خطر بات کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس خوف سے آزاد ہوتے ہیں کہ یہ ہماری اصلیت سے واقف ہیں۔اس لیے سوشل میڈیا فرینڈز کی آپس میں بے تکلفی زیادہ پائی جاتی ہے نسبتاً ان دوستوں کے جو آپ کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔وہ ان سے کسی قسم کی بات کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔ افسانہ فیک میں اس بات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

> ''ہم ہر موضوع اور ہر مسئلے پر بات کر لیتے،آہستہ آہستہ یہ موضوعات پھیلتے چلے گئے۔سنا ہے لوگ ان باکس میں جنس پر بات کرتے ہیں جو سیکس چیٹ کہلاتی ہے،ہم جنس پر بات کرنے سے کبھی نہیں کتراتے لیکن یہ بات سنجیدہ اور پر مغز ہوتی۔''(۳۱)

آج کل کے دور میں جنس کا اپنے ہم جنس کو دھوکا دینا عام بات ہو گئی ہے۔یہ سوشل میڈیا کے غلط استعمال کرنے کے زمرے میں آئے گا۔یہ انسان کے اخلاقی زوال کا موجب ہے انسان اپنی پہچان اور شناخت کو کھو چکا ہے۔ وہ ہم جنس کو دھوکا دے کر تسکین حاصل کر رہا ہوتا ہے۔افسانہ ''فیک'' میں جاوید انور نے اس رویے کو دکھایا ہے کہ فیک آئی ڈی صبا اسماعیل کے نام سے ہے۔اس کے عقب میں در حقیقت مرد چھپا ہوا ہوتا ہے کیونکہ صبا اپنے

دوست کے بے حد اصرار کے باوجود اس سے فون پر بات کرنے یا ملنے پر راضی نہیں ہوتی۔اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت کے روپ میں چھپا ہوا مرد ہے۔اس مسئلہ کو کردار کا دوست اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر مرد کے اندر ایک عورت اور ہر عورت کے اندر ایک مرد چھپا ہوا ہوتا ہے جیسا کہ افسانہ فیک میں ''ہر مرد میں ایک عورت اور ہر عورت میں ایک مرد موجود ہوتا ہے۔''(۳۲)

اس بات کو ماہر نفسیات دان ژونگ نے ایک صدی پہلے انکشاف کیا کہ ''ہر تخلیق کار میں اس کی صنف سے الٹ صفات بھی بڑی طاقتور ہوتی ہیں۔''(۳۳)اس طرح زنانہ مردانہ ثنویت کا فیک اکاؤنٹ بنانا جاوید انور اپنے افسانے فیک میں اجاگر کرتے ہیں۔وہ اپنے فیک اکاؤنٹ کا نام سیمیں شہاب رکھتا ہے۔''میں اس بیانیے کو ہر ممکن حد تک ذاتی تجربہ بنا کر کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی فیک آئی ڈی کا نام سیمیں شہاب رکھا ہے۔''(۳۴)

اسی طرح آج کے جدید عصری دور میں فیک اکاؤنٹ بنانا عام سی بات ہو گئی ہے۔لوگ بغیر کسی جھجک کے ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

ب:۔جدید طرز زندگی کی اخلاقی جہات اور مذہبی تناظر:

موجودہ دور میں سائنس کی نت نئی ایجادات نے ترقی یافتہ دور کی بنیاد رکھی۔ ہمارا معاشرہ زرعی معاشرے سے صنعتی معاشرے میں تبدیل ہونے لگا۔ کیونکہ معاشرتی تبدیلی ایک ہمہ جہت عمل ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انسان سیکھنے یا غور و فکر کے عمل کو جاری رکھے۔ کیونکہ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ غور و فکر اور تحقیق کے شعبے کو نہیں اپناتا۔ قرون اولی کے مسلمانوں نے اپنی تحقیق کو جاری رکھتے ہوئے رومی اور یونانی علوم سے استفادہ کیا۔اور ان علوم کو اپنی زبان میں متعارف کرنے کے لیے عربی زبان میں تراجم کیے۔اس طرح مسلمان اپنی تحقیق کو جاری رکھتے ہوئے علم و تحقیق میں اضافے کا سبب بنے اور دنیا میں بارہ سو سال تک اپنی حکمرانی قائم رکھی۔جب اہل یورپ ہنوز تاریکی کے دور میں تھے لیکن جیسے ہی انہوں نے علم و تحقیق کے عمل کو دوبارہ اپنایا اور مسلم اقوام کی کتابوں کے تراجم اپنے زبان میں کیے اور نہ صرف ان سے استفادہ اٹھایا بلکہ اپنی تحقیق کا عمل جاری رکھتے ہوئے ان علوم میں مزید اضافہ بھی کیا تبھی وہ نئے علوم کو بھی سامنے لائے۔اس طرح انہوں نے اپنی تحقیق و تجربے سے دنیا میں اپنا نام دوبارہ زندہ کیا۔ جبکہ مسلم اقوام جو علم کا سرچشمہ تھے وہ پیچھے رہ گئے اور اہل یورپ

غالب آ گئے۔اپنے تجربات اور مشاہدات سے مادے کو توانائی میں تبدیل کیا جس کی وجہ سے انسانی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔

انسان کے رہن سہن کے طریقے بدل گئے، نئے نئے ایجادات منظر عام پر آنے لگیں۔ریلوے، ٹیلی فون، انٹرنیٹ، ادویات، ہوائی جہاز وغیرہ سائنسی ایجادات کے ساتھ سماجی علوم میں بھی ترقی کی راہیں کھلیں۔دنیا میں ابلاغ کی سہولیات نے دنیا کے فاصلوں کو سمیٹ دیا۔دنیا گلوبل ویلج بن گئی۔اس طرح اہل یورپ کے اثرات تمام دنیا پر پڑے اور مشرقی ممالک نے بھی ان اثرات کا اثر لیا اور علم و تحقیق کے میدان کی طرف رجوع کیا۔زرعی دور سے نکل کر صنعتی دور میں قدم رکھا اور لوگ جاگیر دارانہ نظام کو ترک کر کے سرمایہ دارانہ نظام کو اپنانے لگے۔

اس طرح انسان کی سوچ اور فکر متاثر ہوئی۔انسان جدید دور میں جدید انداز میں سوچنے لگا۔معاشرتی ترقی میں اضافہ ہوا اور جدید معاشرت کو اپنایا گیا۔اس طرح انسان نے جب جدید طرز معاشرت کو اپنایا تو انسان سائنسی و صنعتی طریقوں کو اپنانے لگا، اس چیز نے انسان کو نئی سوچ دی۔انسان کو زندگی میں سہولیات اور آسانیوں سے نوازا۔انسان کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔جہاں صنعتی ترقی نے انسان کو آسائشوں سے نوازا وہیں بہت سی مشکلات اور خطرات سے بھی دوچار کیا۔بہت سی اخلاقی اور مذہبی گراوٹیں بھی سامنے آئیں، انسان کی مشینی دور میں وقعت کم ہونے لگی۔انسان لاحاصلی کا شکار ہونے لگا، انسان اپنی پہچان اور سکت کو برقرار رکھنے کی تگ و دو میں زندگی کے اہم مقاصد کو بھولنے لگا۔آج کے دور کا تخلیق کار اس بدلتے ہوئے معاشرے کی کیفیات اور حالات کو محسوس کرتا ہے کیونکہ ہر ادیب اور مصنف اپنے معاشرے کے مسائل سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔وہ اپنی تخلیقات میں عصر حاضر کے تمام شعبوں کی عکاسی کرتا ہے شہزاد منظر ادیب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''ادیب کسی بھی معاشرے کا ایک خاص نمائندہ ہوتا ہے۔ادیب اپنے معاشرے کا مصور ہوتا ہے، کیونکہ ادیب اپنی کہانیوں کے ذریعے اپنے عہد کی سیاسی و سماجی، ادبی، معاشرتی حالات کی تصویر کشی کرتا ہے۔''(۳۵)

اس لئے آج کا افسانہ نگار عصر حاضر کے تمام مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔جدید انسان صنعتی اور سرمایہ داری کے دور میں جی رہا ہے۔تمام سہولیات کے باوجود بہت سے مسائل سے بھی نبرد آزما ہے، کیونکہ جدید دور میں لوگوں کے رہن سہن کے انداز بدل گئے، لوگوں نے جدید طرز زندگی اور رہن سہن کو اپنایا اور اپنی اقدار و روایات کو چھوڑ دیا ہے۔ان کے خیال میں یہی ماڈرن ازم ہے۔اس طرح وہ اپنے آپ کو ترقی یافتہ قوم کی صف میں کھڑا محسوس کرتے ہیں۔اس کے برعکس مذہبی معاشرے کی بنیادی قدریں زیادہ تر مذہب پر منحصر ہوتی

ہیں۔ہر مذہب میں صبح اٹھ کر مختلف رسومات ادا کی جاتی ہیں مثلاً ہندوازم میں بھگوان کی پوجا کی جاتی ہے،اسی طرح باقی مذاہب میں بھی صبح سویرے اٹھ کر اپنے اپنے طریقے سے مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔اسلامی معاشرے میں صبح سویرے اٹھنا، نماز پڑھنا، تلاوت قران کریم کرنا باعثِ برکت خیال کیا جاتا ہے۔ بزرگ صبح سویرے اٹھنے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن آج کے جدید معاشرے میں نوجوان نسل وقت کا خیال نہیں رکھتی اور ناوہ اپنے والدین یا بزرگوں کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔لیٹ اٹھنا ایک معاشرتی فیشن بن چکا ہے۔راتوں کو لیٹ تک جاگنا اور صبح سویرے لیٹ اٹھنا آج کے جدید دور میں عام خیال کیا جاتا ہے۔ جاوید انور نے اپنے الفاظ میں اس روایت کا یوں اظہار کیا ہے:

> ''صبح ۳ بجے اس کی آنکھ اچانک کھل گئی تو بچوں کے چلنے پھرنے اور بولنے کی آوازیں ابھی آرہی تھیں۔ مطلب یہ کہ حسب معمول بچے چار بجے سوئے ہوں گے، بارہ ایک بجے خیر سے اٹھیں گے اور باری باری ناشتہ آرڈر کریں گے۔''(۳۶)

اسی طرح وہ ''دشت وحشت'' میں بھی جدید طرز معاشرت کی عکاسی ملتی ہے جس میں طبقے کے اس فرد کی نمائندگی کی گئی ہے جو ناشتے سے پہلے اٹھتے ساتھ بیڈ ٹی پیتے ہیں۔ ''صبح صبح ہی صاحب جی، ناشتے میں دیر ہے آپ تو بیڈ ٹی لیتے ہو گے ؟۔''(۳۷)

اس طرح لوگوں کے رہن سہن کے انداز بھی بدلنے لگے۔ صنعتی و سرمایہ دارانہ نظام میں لوگوں کے معاشی حالات بہتر ہونے لگے۔ لوگ بہتر زندگی گزارنے اور تمام سہولیات سے استفادہ کرنے کے لیے ہاؤسنگ سوسائٹی کا رخ کرنے لگے۔ بنگلے اور گاڑیاں آج کے دور میں اسٹیٹس کے ساتھ ساتھ بنیادی ضرورت بن گئی ہیں۔ ''بھڑ'' افسانے میں اس جدید رویے کی عکاسی ان الفاظ میں ملتی ہے کہ: ''ابا کی زنگ آلود بائیسکل پر سکول جانے والا ارسلان چمچماتی گاڑیوں اور شہر کی مہنگی ہاؤسنگ سوسائٹی میں بڑے بنگلے کا مالک بن گیا۔''(۳۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید دور نے انسان کے معاشی حالات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔انسان کے رہن سہن کے انداز میں تبدیلی آئی ہے۔لوگ گاؤں اور قصبوں سے ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف رخ کرنے لگے ہیں۔ گاڑیوں پر سفر کرنا عام معمول ہو گیا ہے۔ارسلان جو مڈل کلاس گھرانے کا فرد ہوتا ہے وہ اپنے باپ کے کام کو جدید طریقوں کے ذریعے بڑھاتا ہے اور چھوٹی سی کباڑ کی دکان سے سکریپ ڈیلر بن جاتا ہے۔اس طرح جدید دور کے تقاضوں کے مطابق باوقار زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن جدید دور کی ترقی میں انسان بہت سی اخلاقی قدروں کو بھی پامال کر گیا ہے۔انسان اس مشینی دور میں خود کو ہر کام سے فارغ سمجھتا ہے انسان کے اندر

محنت کرنا اپنا کام خود کرنے کا جذبہ عنقا ہو رہا ہے۔ انسان کے نزدیک صرف پیسہ کمانا ضروری ہے انسان جو مالی طور پر مستحکم ہوتا ہے وہ اپنا کام پیسوں کے بل بوتے پر دوسرے لوگوں سے کرانا فخر سمجھتا ہے۔ پہلے لوگ اپنا کام خود کرنے کو باعث عار نہیں سمجھتے تھے۔ یہ رویہ ایلیٹ کلاس کے لوگوں میں عام پایا جاتا ہے۔ افسانے ''بھڑ'' میں اس رویے کی عکاسی یوں کی گئی ہے

> ''اللہ نے انہیں سہولتیں دی ہیں تو یہ کیوں ان کا پورا فائدہ نہ اٹھائیں۔ آپ کا باپ گنج منڈی کا کباڑیہ تھا جبکہ انکا باپ شہر کا بڑا سرمایہ دار سٹیل فرنس اونر ہے۔ معززین شہر میں سے ہے، کیوں یہ ذرا ذرا سے کام کے لیے ہماشما کے متھے لگیں؟؟؟ کیوں معمولی کاموں کے لیے لائنوں میں دھکے کھائیں۔''(۳۹)

اسی طرح اسی افسانے میں آگے چل کر ارسلان سکریپ ڈیلر جو اپنی محنت سے اس مقام تک پہنچا ہے، اور وہ معاشرے کی اخلاقی اقدار اور محنت کے جذبے سے واقف ہوتا ہے، وہ اپنے بچوں میں یہ اقدار، جو ہمارے مذہب اور معاشرے کا اہم جزو ہیں، ان سے آگاہ کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی بیوی یہ بات نہیں سمجھتی ہے۔ اس کے خیال میں بچوں کو یہ چھوٹے چھوٹے کام نہیں کرنے چاہیے۔ یہ پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنیں گے۔ اس لئے ان کو چھوٹے موٹے کام خود کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو ایک خاص معیار زندگی سے نیچے آکر نہیں سوچنا چاہیے، نہ ہی کام کرنا چاہیے۔ یہ رویہ ایک ماں کے اخلاقی اقدار کا زوال ہے۔ جدید ماں اپنے بچوں کو تساہل پسند بنا رہی ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں بچے اپنا کام خود کریں گے تو وہ ایلیٹ طبقہ کے لحاظ سے درست نہیں ہو گا۔ جب کہ ہماری اسلامی تعلیمات میں اپنا کام خود کرنے کا حکم بہت سی جگہوں پر دیا گیا ہے۔

نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کام خود کرتے تھے۔ ہمیں بھی تلقین کی گئی ہے کہ اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کریں۔ لیکن آج کے جدید دور میں اپنا کام خود کرنے کو باعث عار خیال کیا جاتا ہے۔ جو کہ اخلاقی و معاشرتی لحاظ سے درست نہیں۔ ''بھڑ'' افسانے میں اس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے۔ ''یہ پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنیں گے تو انہیں زندگی ایک بڑے معیار سے نیچے اترنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔''(۴۰)

لیکن جو لوگ محنت کر کے ایک خاص مقام حاصل کر لیتے ہیں وہ زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ انسان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ مسلسل جدوجہد نہ کرے، کیونکہ زندگی نام ہی حرکت کا ہے۔ جامد و ساکت رہنا موت کی علامت ہے۔ دنیا میں وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں جو اپنا کام خود کرتی ہیں، کیونکہ انسان زندگی کے تجربات سے اچھائی و برائی کی پہچان حاصل

کرتا ہے۔ یہ تجربات درست راستے پر گامزن ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن جدید دور میں اس کے بر عکس رویہ اپنایا جاتا ہے۔ افسانہ ''بھڑ'' میں ارسلان بھی اپنے بچوں کو زندگی کے نشیب و فراز سے واقف کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے تاکہ اس کے بچوں کو زندگی کی تلخیوں اور مصائب سے آگہی حاصل ہو سکے۔

''میں تو کہتا ہوں انہیں ہر کام آنا چاہیے زندگی کو اندر گھس کر دیکھنا چاہیے۔ اچھے برے کی پرکھ ہونی چاہیے۔ زندگی کا ہر رنگ ڈھنگ ان کے تجربے مشاہدے اور برداشت میں اضافے کا باعث بنے گا۔''(۴۱)

ہمارا معاشرہ سائنسی عہد کے آغاز کے ساتھ ہی زندگی کی مسلمہ قدروں کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ ان اقدار کو فراموش کر کے ترقی کے کرشمات میں گم ہو گیا ہے۔ انسان اپنے برزگوں کے بتائے ہوئے تمام اصول و ضوابط کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ جدید مشینی دور نے انسان کو سہل پسند بنا دیا ہے۔ انسان معاشرے کی تمام اخلاقی و مذہبی اقدار کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ محنت کی عظمت کا درس جو ہر دور میں ضروری ہے، بچوں کو ان اسلامی و اخلاقی اقدار سے روشناس کرانے کی اشد ضرورت ہے۔ تاکہ وہ زندگی کے اتار چڑھاؤ کو سمجھ سکیں اسی طرح زندگی کے بہت سے شعبوں میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انسان کے قیام وطعام، لباس، رسوم ورواج وغیرہ میں تبدیلی رونما ہوئی۔ آج سے تقریباً سو سال پہلے پینٹ کوٹ کو مغرب کا لباس خیال کیا جاتا تھا لیکن عصری صنعتی و سرمایہ دارانہ دور میں اس لباس کو بین الاقوامی طور پر دفتری لباس سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح اسلامی معاشروں میں بھی پینٹ کوٹ کا چلن عام ہو گیا ہے۔ نہ صرف مردوں میں پینٹ کوٹ بطور لباس استعمال ہونا شروع ہوا بلکہ خواتین بھی یہ لباس پہننے لگیں۔ خواتین میں شلوار قمیض کی جگہ پینٹ کوٹ کا استعمال کرنا عام سی بات سمجھی جانے لگی۔ اس لباس کو پہن کر ماڈرن خیال کیا جانے لگا۔ ماڈرن ازم کو افسانے ''غرض'' میں اس طرح اجاگر کیا گیا ہے۔

''انٹرویو والے دن بھی جین اور جیکٹ میں ملبوس بے پرواسی فریدہ جیسے اسے فکر ہی نہ ہو کہ اس نے کیا پہن رکھا ہے اور کس کام سے آئی ہے۔ یہاں کس لباس کی توقع کی جاتی ہے۔''(۴۲)

پاکستان جاوید انور نے افسانے عرض میں فریدہ کو ایک شہر کی ماڈرن، لاپرواہی سی لڑکی کے طور پر دکھایا ہے کہ جو اپنی مشرق کی تمام تہذیب و تمدن سے بے پرواہ ہو چکی اور جدید معاشرے کی پُر اعتماد لڑکی کے روپ میں ڈھل چکی ہے۔

اسی طرح قدیم معاشرے میں تہہ شدہ شادیوں کا زیادہ رواج تھا۔ والدین اپنی مرضی سے بچوں کی شادیاں طے کرتے اور بچوں کو انکار یا اقرار کا حق دیا کرتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ رواج ختم ہو گیا ہے۔

جدید دور میں لڑکے لڑکی ایک دوسرے کو خود پسند کر رہے ہیں اور والدین بھی بچوں کی پسند اور ناپسند کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ لیکن جدید دور میں لڑکا لڑکی کے گھر والے راضی نہ ہو تو آج کے اس پڑھے لکھے معاشرے میں بچے والدین سے بغاوت کر کے خود شادی کر لیتے ہیں۔ پڑھے لکھے معاشرے میں لڑکا لڑکی کسی بھی معاشرتی و خاندانی پابندی کو نہیں مانتے ہیں۔ وہ اپنے فیصلوں میں خود کو آزاد محسوس کرتے ہیں۔ جیسا کہ افسانہ ''غرض'' میں: ''منگنی میں کوئی دقت پیش نہ آئی، فریدہ کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنی مرضی کا جیون ساتھی چن لے۔ فرخ پڑھ لکھ کر خاندانی حلقے سے تقریباً خارج ہی ہو چکا تھا۔''(۴۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر حاضر کے دو طبقات کے رویے آمنے سامنے ہیں۔ ایک ایلیٹ کلاس یعنی امیر طبقہ جو اپنی اولاد کی مرضی اور خواہش کو سامنے رکھتے ہوئے بخوشی فرخ سے شادی کر دیتے ہیں۔ ان کو اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ فرخ کے گھر والے راضی نہیں۔ فرخ کے خاندان والے سادہ دیہاتی لوگ ہوتے ہیں وہ فرخ کی شادی سے ناخوش ہو کر اس سے اپنا ہر رشتہ ناطہ توڑ لیتے ہیں۔ جبکہ فریدہ کے گھر والوں کو اس بات سے فرق نہیں پڑتا۔ ان کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کی بیٹی خوش ہے اور لڑکا پڑھا لکھا نوجوان ہے، جو اپنے خاندان والوں پر معاشی طور پر انحصار نہیں کرتا ہے۔ یہ فرخ اور فریدہ کا جدید رویہ ہے جس میں ان کو بزرگوں کی کسی خوشی یا ناراضی کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ خود کو آزاد اور خود مختار تصور کرتے ہیں۔ ''فرخ کو یہاں کہنے کے لیے کسی کی اجازت یا صلاح بھی نہیں چاہیے۔''(۴۴)

ایک منفی رویہ ہے اخلاقی و معاشرتی طور پر منفی اقدام تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان نے جہاں بہت سے میدانوں میں ترقی کی، انسانوں کے لئے آسانیاں پیدا ہوئیں، وہیں بہت سی دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ آج کے سوشل میڈیا کے دور میں لڑکا لڑکی کو مکمل طور پر آپس میں ملنے، موبائل فون پر بات کرنے کی آزادی ہوتی ہے اس لیے شادی بیاہ کے فیصلوں میں بھی بڑوں کی رائے لینا ضروری نہیں سمجھتے۔ اس رویے کی عکاسی جاوید انور کے افسانے ''غرض'' میں ان الفاظ میں ملتی ہے:

> ''گھنٹوں پر محیط دورانیے، دفتر، پارک، کیفے اور گاڑی میں سلوڈرائیونگ میں پارک کر گزارے گئے۔ موبائل فون پر نیم شب آخر شب میں ڈھل گئی اور سحر میں اترے کئی مباحث تکمیل کو پہنچے اور کئی نامکمل رہ گئے۔ بالآخر دونوں اس غیر حتمی نتیجے پر پہنچے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''(۴۵)

جدید شہری معاشرت میں یہ رواج بھی عام ہو گیا کہ لڑکا لڑکی کا راضی ہونا ضروری ہے۔ ان کو نہ تو کوئی اخلاقی یا خاندانی پابندی کا سامنا ہوتا ہے۔ والدین کو ہر صورت میں بچوں کی رضامندی میں شامل ہونا اور کھلے دل

سے ان کو قبول کرنا ہوتا ہے۔

اسی طرح قدیم معاشرے میں شادی بیاہ کی رسومات باقاعدہ معاشرتی و خاندانی طریقہ کار کے مطابق ہوتی تھی، جس میں دونوں خاندانوں کے سربراہان کے علاوہ رشتہ دار دوست وغیرہ کی شرکت بھی ہوتی تھی۔ برات، ولیمے کی باقاعدہ رسومات کا انتظام کیا جاتا تھا۔ لیکن آج کے صنعتی دور میں شادی بیاہ میں لڑکا لڑکی کا راضی ہونا ضروری ہے۔ خاندان والوں یا رشتہ داروں کی شرکت کو ضروری تصور نہیں کیا جاتا۔ جدید دور میں لڑکا لڑکی خود تمام معاملات طے کر لیتے ہیں۔ سرمایہ داری کے اس دور میں شادی بیاہ کی رسومات گھروں کی بجائے شادی ہال یا ہوٹلوں میں ادا کی جارہی ہوتی ہیں۔ جاوید انور کے افسانے ''غرض'' میں اس رویے کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی گئی ہے۔

> ''شادی دھوم دھڑکے سے ہوئی۔ رخصتی ولیمہ کی مشترکہ تقریب شہر کے بہترین ہوٹل میں رکھی گئی۔ فرخ کی طرف سے بارات مختصر اور اس کے سابق ہم جماعتوں، پسندیدہ اساتذہ اور قریبی دوستوں پر مشتمل تھی۔''(۴۶)

اس اعتبار سے جدید دور کے رسم و رواج کی نشاندہی کی گئی کہ شادی جیسی اہم تقریب کو والدین اور رشتہ داروں کے بغیر ادا کر دیا جاتا ہے۔ بزرگوں کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پیسے کے بل بوتے پر ہوٹل میں شادی کے انتظامات کر دیے جاتے ہیں۔ اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ترقی کے ساتھ کس طرح معاشرتی و اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیتا ہے۔

انسانی زندگی میں اخلاقی اور مذہبی جہاد کا گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی میں افکار کا تعلق عقائد سے، عبادت کا شریعت سے اور معاملات کا تعلق اخلاق سے رہتا ہے۔ اعلیٰ افکار و کردار اخلاق کو مستحکم کرتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد اعلیٰ اخلاق کی ترویج کرنا بھی ہے۔ کیونکہ انسان جتنا اخلاق میں اچھا ہوگا اس کے اندر دوسرے انسانوں کے لیے ہمدردی اور احترام کا جذبہ پیدا ہوگا۔ وہ بھی کسی انسان کو کسی وجہ سے کمتر نہیں سمجھے گا اور ایک بااخلاق آدمی میں دیانت و امانت کا جذبہ بھی راسخ ہو جاتا ہے۔ دین اسلام نے اخلاقیات پر بہت زور دیا ہے بلکہ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔ پوری دنیا میں دین اسلام اخلاق کی بدولت پھیلا ہے۔

تمام مسائل کا حل بھی اخلاقیات پر منحصر ہے پہلے زمانے میں لوگوں کو اتنی سہولتیں میسر نہیں تھی لیکن ان کے اندر اخلاق موجود تھے۔ لوگوں میں امانت داری، سچائی، قناعت جیسی صفات موجود تھیں۔ لوگوں کے اندر

لین دین کے معاملات میں امانت داری کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ لوگوں کے اندر تقوی اور توکل کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ لوگ لین دین کے معاملات میں امانت داری کا مظاہرہ کرتے تھے، اس کو برکت کا سبب خیال کرتے تھے۔ دین اسلام میں بھی لین دین کے معاملات میں عدل وانصاف اور امانت داری کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ قران پاک میں اس کی تاکید ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ جب تولو تو سیدھی ڈنڈی سے تولو اور کسی کو اس کا حق کم نہ دو۔

اس لئے امت مسلمہ میں اخلاقی و مذہبی جہات کا راسخ ہونا بہت ضروری ہے۔ جاوید انور کے افسانوں میں دین محمد کا کردار اخلاقی و دینی لحاظ سے سمجھ بوجھ والا انسان ہے۔ اس کا یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر گاہکی میں ماپ تول سے پلڑا زیادہ رکھا جائے تو رزق میں برکت پیدا ہوتی ہے۔ دین محمد جیسے کھلے دین والے دکاندار ترازو کو تھوڑا سودے کی سمت جھکا چھوڑ دیتے بلکہ اوپر سے چٹکی بھر اور ڈال دیتے جو ان کے خیال میں ان کے گاہکی میں برکت کا سبب بنتا۔

انسانی شخصیت سازی میں مذہب اور اخلاق کا بہت کردار نظر آتا ہے۔ ہر انسان کے مزاج میں اخلاقی مادہ موجود ہوتا ہے، اسی کی بنا پر انسانی اعمال کا دار و مدار ہوتا ہے کیونکہ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو وہ تمام رذائل سے پاک ہوتا ہے۔ جب وہ اس دنیاوی زندگی کے مزاج سے واقف ہوتا ہے تو دنیاوی اسباب و عوامل اس کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان اسباب و عوامل کی بعد میں تطہیر کی ضرورت ہوتی ہے۔

لیکن آج کا ہمارا جدید معاشرہ شدید اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔ جدید طرز زندگی نے انسان کو تمام اخلاقی اقدار سے غافل کر دیا ہے۔ ہر انسان ماڈرن ازم کے چکروں میں بے راہ روی کا شکار نظر آتا ہے، جو کہ ہمارے آنے والی نسلوں کے لیے خوش آئین بات نہیں ہے۔ جدید انسان خود کو تمام اخلاقی و مذہبی اقدار سے ماورا تصور کرتا ہے، جو کسی بھی معاشرے کے زوال کا سبب ہے۔ جاوید انور نے اپنے افسانے ''بھڑ'' میں اس بات کی وضاحت کچھ یوں کی ہے۔

> ''میں بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنا ہر کام خود کریں۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان کو ہر کام خود آنا چاہیے، زندگی کے اندر گھس کر دیکھنا چاہیے، اچھے برے کی پرکھ ہونی چاہیے۔ زندگی کا ہر رنگ ڈھنگ ان کے تجربے مشاہدے اور برداشت میں اضافہ کا باعث بنے گا۔''(۴۷)

سخت محنت اور جفاکشی سے کام کرنا ہی انسانی زندگی کا راز ہے۔ کیونکہ ایک انسان انفرادی و اجتماعی طور پر تب ہی معاشرے کا ایک کارآمد رکن بن سکتا ہے جب اس کے اندر محنت کا جذبہ راسخ ہو۔ کیونکہ زندگی میں جفاکشی اور محنت انسان کے اندر خودی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اس اقتباس میں بھی ایک باپ جو محنت کے بل بوتے اور جدید معاشرے کے تقاضوں کے مطابق طرز زندگی گزارنے کے قابل ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کے بچوں کو ہر کام

آئے تاکہ وہ زندگی کے نشیب و فراز میں گھس کر اچھائی برائی کی پرکھ کر سکیں، ان کے اندر اخلاقی اقدار، برداشت، عمل جیسی صفات پیدا ہو سکیں تاکہ وہ معاشرے کے کامیاب انسان کی صف میں شامل ہو جائیں۔ اخلاق وہ دولت ہے جس سے انسانی شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے۔

ج:۔ جدید و قدیم تصور حیات کی کشمکش:

جدید و قدیم تصور حیات کی کشمکش انسانی زندگی کے ساتھ مشروط ہوتی ہے کیونکہ انسان ایک معاشرے کا اہم فرد ہے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے معاشرتی تبدیلیوں کو قبول کرنا ضروری ہوتا ہے۔ معاشرہ ایک ہمہ جہت تبدیلی کا عمل ہے، یہ تبدیلی دنیا کے تمام معاشروں میں وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔ دور قدیم سے لے کر دور جدید تک مختلف معاشرے ایک دوسرے کو متاثر کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی معاشرہ دوسرے کسی معاشرے سے زیادہ ترقی کر لیتا ہے تو اس کے اثرات دوسرے معاشروں پر پڑتے ہیں۔ ترقی یافتہ معاشرہ ترقی پذیر معاشروں کو سیاسی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی، تعلیمی طور پر زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اس طرح جدید و قدیم کی کشمکش ازل سے ابد تک چلتی رہے گی۔ تبدیلی ایک وسیع عمل ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ ان تبدیلیوں کے اثرات معاشرے پر پڑتے ہیں۔ جیسے قرون اولیٰ میں مسلمانوں کے اہل علم نے رومی و یونانی علوم سے استفادہ کر کے ان کے علوم کے تراجم عربی زبان میں کیے جس سے مسلم معاشروں کے علم و تحقیق کے میدان میں ترقی ہوئی۔ ان میں نئے علوم سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ تب اہل یورپ کا تاریک دور تھا لیکن جب انہوں نے سیکھنے کا عمل شروع کیا تو انہوں نے دنیا کے ہر میدان میں اپنا نام پیدا کیا اور دنیا کے نقشے پر غالب قوم کے طور پر ابھرے۔ اس طرح معاشروں میں تبدیلی کا عمل وقتاً فوقتاً جاری رہتا ہے۔ معاشرے قدیم سے جدید کی طرف سفر کرتے ہیں۔

اسی طرح ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے یہاں کے لوگ زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کا بول بالا تھا لیکن جوں جوں ترقی ہوتی گئی لوگوں کے اندر شعور بیدار ہونے لگا۔ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ لوگ زرعی دور سے نکل کر صنعتی دور میں داخل ہوئے تو انسانی معاشروں میں تبدیلی کے ساتھ ادب کے میدان میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اظہار کے طریقوں میں تبدیلی اور ادب کا تعلق حقیقت سے جڑنے لگا۔ ادیب اپنے ارد گرد کے ماحول کے اثرات کو محسوس کرنے لگا اور معاشرتی و سماجی تبدیلیوں کو ادب کا حصہ بنانے لگا۔ لوگ حقیقی زندگی کے نشیب و فراز کو جاننے لگے۔ رومانوی دنیا سے نکل کر حقیقت میں رہنے لگے۔ تجارتی و صنعتی سرگرمیوں میں تیزی آنے لگی، خطے میں معاشی و معاشرتی تبدیلیاں رونما ہونے لگی۔ اس طرح

زرعی وجاگیر دارانہ نظام کے ساتھ تجارتی و صنعتی سر گرمیوں میں اضافہ ہوا تو ایک جدید و قدیم کی کش مکش نے جنم لیا۔

لوگوں نے قدیم سے جدید کی طرف سفر کیا تو بہت سے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لوگوں نے دیہات سے شہروں کی طرف رخ کیا۔ ادب میں جہاں دیہاتی فضا کا عنصر ادب کا موضوع رہا وہاں اب شہری زندگی کے مسائل کو بھی مصنفین نے ادب میں جگہ دی کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ دیہاتوں کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ شہروں میں صنعتی و سرمایہ دارانہ نظام نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں۔ اس طرح لوگوں نے دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی شروع کی۔ اس طرح شہری اور دیہاتی معاشروں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تہذیب و تمدن کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ذہنی صورتحال پر بھی ان تبدیلیوں نے اثر ڈالا۔ جس نے ان کے سوچنے کے انداز، شخصی اور اجتماعی زندگی کو متاثر کیا۔ انسان معاشرے میں جن تہذیبی و ثقافتی رویوں کو ترتیب دینے کی سعی کر رہا ہوتا ہے آنے والے وقتوں میں وہ انہی کو بدل رہا ہوتا ہے۔ ایسی تبدیلیاں لوگوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہو کر مثبت و منفی نتائج کو جنم دے رہی ہوتی ہیں یہ اختلاف ایک نئی صورتحال کو سامنے لاتا ہے۔ پہلے مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش نظر آتی تھی اب وہاں لینڈ سکیپ کے ساتھ لوگوں کی طرز معاشرت میں بھی واضح تبدیلیاں سامنے آنے لگیں۔ جس سے بہت سے نفسیاتی مسائل بھی سامنے آئے۔ لوگوں میں قدیم و جدید کی کشمکش پیدا ہونے لگی۔

معاشرے کی ان تبدیلیوں نے ادب پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اردو افسانے میں ان تبدیلیوں کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کیونکہ آج کے اس دور میں دیہات سمٹتے اور شہر پھیلتے جارہے ہیں، اپنے آس پاس کے قصبوں کو نگلتے جارہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ طبقہ مزدوروں اور درمیانے درجے کے لوگوں پر غالب آگیا ہے۔ جاوید انور نے اپنے افسانے ''بارزیست'' میں اس کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے۔

> ''قصبہ شہر کی صورت اختیار کرنے لگا۔ نئے سٹور کھلنے لگے۔ وہ لوگ کاروبار میں آگئے جن کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ پرانے قصبے والے بڑھاپے کو پہنچنے لگے۔ نئی نسل کو نہ دین محمد کے مسلمہ دیانت داری کا کوئی لحاظ رہ گیا نہ اس کی رواداری کی فکر۔''(۴۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی ضروریات نے انسان کی اخلاقی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ انسان کی پہچان کا معیار اب اخلاقی اقدار نہیں بلکہ سماجی رتبہ بن گیا ہے۔ انسان اپنی شناخت کھو رہا ہے، مادیت پرستی انسانوں پر غالب آنے لگی ہے۔ معاشرتی اقدار کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے لاتعلق

ہو گئے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مضمون مدرسے اور مولسری سے لکھی کہانی میں اس بات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''شہر کا مکین، چھوٹی اینٹ کا مکان، ٹھہرے ہوئے لوگ، فریب گزیدہ میں شہر اور قصبے کی کشمکش ہے۔ ہماری معاشرتی جڑوں کو سب سے بڑا خطرہ شہروں کی بے چہرہ اور مصنوعی زندگی سے ہے۔ شہر قصبوں کو نگلتے جارہے ہیں اور میکانکی خوشیاں ان جڑوں کو کاٹتی جارہی ہیں۔''(۴۹)

معاشرہ تغیر پذیر عمل سے گزرتا ہے۔ معاشرتی تبدیلیاں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ رونما ہوتی رہتی ہیں،ان تبدیلیوں نے قصبہ میں رہنے والے مکینوں کو احساس محرومی کا شکار کر دیا ہے۔ سرمایہ دارانہ طبقے نے دیہاتی لوگوں کے روزگار کو بھی نگل لیا۔ صنعتی و سائنسی ترقی سے معاشی و معاشرتی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ قصبے شہروں میں بدلنے لگے تو لوگوں کی طرز معاشرت میں تیزی آگئی۔ جس سے قصبے کے سادہ لوگ اس تیز شہری زندگی میں اپنی پہچان کھونے لگے۔افسانہ ''بار زیست''میں اس بات کا اظہار ان الفاظ میں ملتا ہے۔

''روایتی سٹور کی بھر بھری چٹان جدید جنرل سٹورز کے منہ زور سیلاب کے سامنے قائم رہ سکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا کہ نئی افتاد آن پڑی۔ آبادی کے پیش نظر حکومت نے اس سب تحصیل کو مکمل تحصیل کا درجہ دے دیا، سرکاری دفاتر ،ہسپتال پہلے سے بڑے تعمیر کئے گئے۔''(۵۰)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین محمد کا سٹور جدید طرز کے سٹورز کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہوتا ہے، کیونکہ قصبے شہر میں بدلنے لگے، صنعتی ترقی نے چھوٹے دوکانداروں کی اہمیت کو کم کر دیا۔ سرمایہ دار طبقے کے جدید طرز کے سٹور سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ لوگوں کا چھوٹے سٹورز پر آنا جانا کم ہو گیا جس کی وجہ سے نچلا طبقہ متاثر ہوا۔ صنعتی و سرمایہ داری نے ہر انسان کو مادی آسائشوں کے خواب دیکھائے لیکن ان تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں عدم اطمینان، مایوسی اور عدم تحفظ کی فضا پیدا ہو گئی۔

اسی طرح جاوید انور نے ''نیرنگی''افسانے میں دیہاتی اور شہری تمدن کا سنگم تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی نے ارد گرد کے گاؤں کو نگل لیا ہے۔ لوگ طرز زندگی اور معاش کے لئے شہروں کی طرف نقل مکانی کرتے ہیں تو آبادی کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ نیرنگی افسانہ میں شہری تمدن کے پھیلاؤ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔''ہمارا گاؤں اب بالکل شہر کے ساتھ لگ گیا ہے۔ گاؤں تو کیڑی کی

رفتار سے بڑا ہے لیکن شہر چھلانگیں لگاتا گاؤں تک آ پہنچا ہے۔"(۵۱)

جہاں شہروں نے گاؤں کو اپنے اندر سمیٹ لیا وہیں صرف زمین کے مسائل نے جنم نہیں لیا بلکہ گاؤں کے قدرتی ماحول پر گہرے اثرات مرتب کیے، گاؤں کے سرسبز ہریالی ماحول کو نگل لیا، اس طرح گاؤں کی ثقافت بھی متاثر ہوئی۔ "نیرنگی" افسانے میں گاؤں کی مرجھائی ہوئی ثقافت کی عکاسی ان الفاظ میں ملتی ہے۔

"گاؤں میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ گاؤں سمٹ کر ایک نو تعمیر شدہ چار دیواری میں قید ہو گیا۔ جہاں آبادی کے چاروں طرف کھیت کھلیان، ڈیرے، جوہڑ اور راستے تھے وہاں اب کنکریٹ کی ساڑھے چھ فٹ اونچی دیوار نظر کو روکتی تھی۔"(۵۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کی سرسبز فطرت کو شہر نے بڑی بڑی عمارتیں بنا کر نگل لیا ہے۔ گاؤں کے زرعی معاشرے کو صنعتی معاشرے میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایلون ٹافلر نے ٹھیک کہا تھا۔

"صنعتی انقلاب نے حیرت انگیز حد تک ایسا مجتمع معاشرتی نظام تخلیق کیا جس کی اپنی واضح ٹیکنالوجیز تھیں لیکن ایک اور سطح پر اس نے زندگی کے رہن سہن میں معاشرتی اضطراب، سماجی مزاحمت اور نفسیاتی ابتری پیدا کر کے معاشرے کے اندرونی اتحاد کو توڑ کر رکھ دیا۔"(۵۳)

شہر کے صنعتی انقلاب نے دیہات کی اراضی کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ گاؤں کی فضا کو بھی متاثر کیا ہے۔ کچی سڑکیں گاؤں کی پکی سڑکوں میں بدل گئی ہے۔ گاؤں میں ذرائع آمدورفت کے ذرائع کی جگہ موٹر گاڑیوں نے لے لی جن کی وجہ سے گاؤں کی پرسکون زندگی متاثر ہونے لگی۔ شور شرابا، ماحولیاتی آلودگی جیسے مسائل پیدا ہوئے۔ گاؤں کی ثقافت متاثر ہونے لگی۔ جاوید انور کے افسانے "بارِ زیست" میں اس بات کو ان الفاظ میں اجاگر کیا گیا ہے۔ "قصبہ شہر بن گیا اور گاڑیوں، موٹر سائیکلوں کا سیلاب امڈ آیا۔ تانگے غائب ہو گئے۔ ان کی جگہ بدنما، بے ڈھنگی اور پر شور چنگچیوں نے لے لی۔"(۵۴)

اس اقتباس سے پتہ لگتا ہے کہ قصبے شہر میں بدلتے ہیں تو ذرائع آمدورفت کے وسائل بدل جاتے ہیں۔ شہروں میں موٹر گاڑیوں، چنگچیوں کے سیلاب نے جہاں کم وقت میں فاصلوں کو سمیٹ دیا، وہاں یہ برق رفتار گاڑیاں ماحول میں فضائی آلودگی پھیلانے کا موجب بنیں۔ اس فضائی آلودگی نے انسان کی صحت کو متاثر کیا معاشرے میں بیماریاں پھیلانے لگیں، لوگوں میں سانس اور دمہ کی بیماری عام ہو گئی۔ سائنس کی ترقی نے جہاں مشینی سہولیات سے آسانیاں پیدا کیں وہاں کچھ نقصانات کا سامنا بھی کرنا پڑا جیسا کہ "بارِ زیست" افسانے میں:

"دھول، مٹی اور ڈیزل، پٹرول کی دھویں کا آمیزہ صبح و شام ہوا پر سوار لوگوں کے نظام تنفس کا وہ

حال کرتا ہے کہ وہ چنگچی سائلینسر بنے پھرتے۔ طرح طرح کی بیماریاں عام ہوتی چلی گئیں۔"(۵۵)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی و صنعتی ترقی نے جہاں انسان کے لیے سہولیات پیدا کیں، وہاں بہت سے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ آج کے اس دور میں ہر دوسرا انسان سانس اور دمہ کی بیماری میں مبتلا ہے۔ ان بیماریوں کا موجب فضائی و زمینی آلودگی ہے۔ پہلے وقتوں میں لوگ ٹانگوں کے ذریعے یا پیدل سفر کرتے، جن کی وجہ سے ان لوگوں کا وقت بہت لگتا اور جسمانی مشقت بھی ہوتی تھی لیکن صحت کے مسائل کم تھے۔ آج کے جدید صنعتی دور نے، ذرائع آمد و رفت کے جدید ذرائع نے انسانوں کے آپس میں فاصلے سمیٹ دیے ہیں۔ انسان کے نہ صرف معاشرتی روابط بڑھے ہیں بلکہ کاروبار میں بھی وسعت آئی لیکن ڈیزل پیٹرول کے دھوئیں کے باعث لوگوں میں طرح طرح کی بیماریاں پھیلیں، جس نے گاؤں کے صاف اور خوشگوار ماحول کو متاثر کیا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے سیل رواں ترقی نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ شہر نے گاؤں پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں، نئی نئی ایجادات نے تمام دنیا کے مختلف علاقوں کو آپس میں اس قدر مربوط کر دیا ہے کہ یہ گلوبل ویلیج یعنی عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر لی ہے تہذیبوں کا ایک دوسرے سے تصادم ہونے لگا ہے۔ صنعتی اور سرمایہ دارانہ دور نے انسان کے حالات زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ گاؤں کے لوگوں کو بہتر ذرائع میسر آئے ہیں۔ لوگوں میں آگاہی پیدا ہوئی ہے۔ گاؤں کا خام مال مہنگے داموں میں بکنے لگا ہے۔ تو لوگوں کی طرز معاشرت میں تبدیلی آنے لگی ہے۔ جاوید انور کے افسانے "نیرنگی" میں شہری معاشرت کے گاؤں پر اثرات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"شہر گاؤں کے پاس آیا تو سب کو فائدہ ہوا۔ بھینسوں کا دودھ پیسوں میں بکنے لگا۔ گوبر تک شہر کے مالی ٹوکریوں کے حساب سے خرید کر لے گئے، چارہ کاٹا تو شہر لے جا کر نوٹوں میں تول کر بیچا۔ پڑھا کو لڑکوں کو گھر کی روٹی کھا کر شہر سے پڑھ کر روز پنڈ واپس آنے کی سہولت ملی۔ کمیوں کے لڑکے فیکٹری میں ملازم ہو گئے۔"(۵۶)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر نے جب گاؤں کی طرف پیش رفت کی تو گاؤں میں معاشی طور پر واضح تبدیلیاں سامنے آئیں۔ دودھ، گوبر دوگنے پیسوں میں بکنے لگا۔ لوگوں کے معاشی حالات بہتر ہونے لگے، گاؤں کے لڑکے جو شہر میں پڑھنے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے، ان کے لیے سہولتیں پیدا کر دیں۔ شہر میں پڑھ کر واپس اپنے گھروں کی طرف لوٹ جانے کی سہولیات نے گاؤں کے نوجوانوں کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔ گاؤں کا طبقاتی نظام جس میں اونچ نیچ کا فرق رکھا جاتا تھا جاگیر دارانہ طرز معاشرت سے جب صنعتی اور سرمایہ

دارانہ معیشت تیزی سے پھیلی توطبقاتی فرق میں کمی آئی۔ گاؤں کے لوگوں نے تعلیم حاصل کرکے نوکریاں حاصل کیں۔

اس طرح شہر کی پیش قدمی نے گاؤں کی ترقی کے راستے کھول دیے۔اس طرح جدید ذرائع آمدورفت نے گاؤں کو شہر سے ملادیاتو سہولیات پیدا ہونے لگیں، معاشرت میں تبدیلی آنے لگی۔نہ صرف لڑکوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شعور اجاگر ہوا بلکہ گاؤں کی وہ لڑکیاں جو گھر کی چار دیواری میں رہ کر ہانڈی روٹی کرنے والی تھیں ان کے اندر بھی تعلیم حاصل کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ وہ مختلف شعبوں سے وابستہ ہونے لگیں۔ شہر کی جدید سہولیات نے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کیااور نت نئی ایجادات وسہولیات سے شناسائی دی۔ گاؤں کے قدیم سادہ لوگوں کی سوچ بدلنے لگی اور ترقی کی راہ ہموار ہونے لگیں۔ ''نیرنگی'' افسانے میں اس تبدیلی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

> ''گاؤں تک دودو پکی سڑکیں آنے لگیں۔ لڑکیاں جو سارا دن گھروں میں گھس کر ہانڈی، روٹی اور کڑھائی کروشیا سے باہر نہیں نکلتی تھی ویگنوں چنگچیوں پر چڑھ کر اسکولوں بلکہ کالجوں تک میں جانے لگی نرس اور استانیاں بن گئی۔''(۵۷)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب معاشرہ قدیم معاشرے سے جدید معاشرے کی طرف گامزن ہوتا ہے تو لوگوں کے اندر شعور پیدا ہوتا ہے۔ خواتین جو چار دیواری کے اندر قید رہتی تھیں، جن کا کام صرف گھر کی دیکھ بھال کرنا اور گھریلو کام سرانجام دینا ہوتا تھا، وہ لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے لگیں کیونکہ گاؤں کی شہر تک رسائی کے ذرائع پیدا ہو چکے تھے۔ سکولوں اور کالجوں تک ذرائع آمدورفت کے جدید ذرائع نے معاشرے کی عورت کو علم کی طرف راغب کیا۔ اس طرح معاشرے میں عورت کی تعلیم بہت بڑی تبدیلی کا موجب بنی۔ اگر عورت پڑھی لکھی ہو گی تو وہ ایک نسل کو پروان چڑھائے گی۔ سماج کی ترقی میں اہم کردار ادا کرے گی، ایک پڑھا لکھا طبقہ وجود میں آئے گا۔

جدید معاشرے نے جہاں عورت کی تعلیم کا شعور دیا وہیں گاؤں کے دوسرے مسائل کو بھی حل کرنے میں مدد کی۔ قدیم معاشرہ طبقاتی نظام، اونچ نیچ کا شکار تھا۔ گاؤں کے غریب اور نیچی ذات کے لوگ جاگیرداروں اور زمین داروں کے آگے بلامعاوضہ کام کرتے تھے۔ ان کے اندر غلامانہ سوچ پیدا ہو چکی تھی لیکن جب معاشرے نے قدیم سے جدید کی طرف قدم بڑھائے تو اس سائنسی اور صنعتی دور نے انسان کے اندر شعور پیدا کیا۔ گاؤں کی زندگی پر بھی اس کے واضح اثرات پڑھنا شروع ہو گئے۔ لوگوں کی جدید مواصلاتی ذرائع تک رسائی نے ان کے اندر

شعور پیدا کیا۔ لوگ اپنے حقوق و فرائض سے واقف ہونے لگے ان کے اندر اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کا حوصلہ پیدا ہوا کیونکہ جدید معاشرتی طرز زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان کو سرمایے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس طرح جاگیر داری نظام کمزور ہوتا گیا۔ لوگ تعلیم حاصل کرنے لگے، ان کے اندر شعور اجاگر ہونے لگا تو انہوں نے غلامانہ زندگی کو ترک کر کے معاوضے پر کام کرنا شروع کر دیا۔

آمدن کے بہتر ذرائع کی تلاش نے ہر انسان کو گاؤں سے شہر کی طرف سفر کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح گاؤں کا فرسودہ طبقاتی نظام کمزور ہوا تو لوگوں نے جاگیر داروں کی غلامانہ زندگی کو خیر آباد کہہ کر شہروں کی طرف بہتر ذریعہ معاش کی تلاش میں جانا شروع کر دیا۔ جیسا کہ ''نیرنگی'' افسانے میں بتایا گیا ہے کہ جدید سماج میں انسان کی محنت کو خریدا جا سکتا ہے۔ پیسوں کے بدلے دوسری خدمات یا ہنر کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

> ''کمی جو سال بعد گندم کے چار من دانے لے کر سال سال بھر ہر طرح کی خدمت کرتے تھے اب کام کرنے کو شہر بھاگتے ہیں۔ دیہاڑ کے حساب سے معاوضہ مانگتے ہیں۔ وہ پہلے والی چودھراہٹ نہیں رہ گئی۔''(۵۸)

آج کے جدید عصری دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ میڈیا، کمیونیکیشن کا انقلاب، انفارمیشن ٹیکنالوجی نے انسان کو معاشی غلامی سے آزاد کر دیا ہے۔ لوگوں کو ذرائع آمدن کے جدید ذرائع سے متعارف کرایا ہے لوگوں کی چھپی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے پرانے فرسودہ ذرائع معاش کو ترک کر کے جدید ذرائع کو اپنا لیا ہے۔ غریب طبقہ جو غریب پروری اور احساس کمتری کا شکار تھا معاشرے میں معاشی طور پر مستحکم ہوا تو نہ صرف خود کفیل فرد کے طور پر سامنے آیا بلکہ ملکی سلامتی اور معیشت کو بہتر کرنے کا موجب بھی بنا یہ تبدیلیاں سرمایہ دار سماجوں میں ہی ممکن ہیں جیسا کہ

> ''نائی جو کچھی (اوزاروں کا چرمی تھیلا) لے کر تھڑے پر بیٹھ کر ہمارے پیچھے کھیتوں کھیتوں پھر کر داڑھیاں مونڈتا اور حجامت بنایا کرتے تھے اب سڑک والے اڈے پر جا کر سیلون بنا کر بیٹھ گئے۔''(۵۹)

جدید دور نے انسان کے اندر سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ لوگوں کے اندر اپنی مہارت اور صلاحیتوں کو بہتر طریقے سے استعمال کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ جدید آمدورفت کی سہولیات نے انسانوں کے درمیان فاصلے کم کیے۔ لوگوں کے زیادہ میل جول معاشرے کے اندر تبدیلی پیدا کی۔ ایک تہذیب نے دوسرے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے تو لوگوں کے اندر آگہی پیدا ہوئی۔ وہ لوگ گاؤں کی غلامانہ زندگی کو ترک

کر کے بہتر زندگی کی تلاش میں نکل پڑے۔ جدید طریقوں کو اپنا کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے جو دوگنے منافع کا سبب بنا۔ جدید و قدیم کی کشمکش میں جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ کر کے صنعتی و سرمایہ دارانہ نظام کو متعارف کرایا۔ طبقاتی نظام کا خاتمہ ہوا لوگوں کو ان کی محنت اور کام کے بل بوتے پر معاوضہ دیا جانے لگا۔ گاؤں کا زمین دارانہ ماحول آہستہ آہستہ ختم ہوا۔ شہر آبادی بڑھنے کی وجہ سے ارد گرد کے گاؤں اور قصبوں کو ساتھ ملانے لگا۔ اس طرح گاؤں کی اراضی جو زرعی ضروریات کے لئے استعمال ہوئی وہاں صنعتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ زمین دار طبقہ کو دگنی قیمت ادا کر کے زمین خرید لی گئی۔ اسکول، کالج، ہسپتال اور صنعتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ''زمین چلی گئی چودراہٹ بھی گئی''۔(۶۰)

زمین اور جائیداد کی خرید و فروخت نے جاگیر دارانہ نظام کو ٹھیس پہنچائی۔ وہیں زمیندار طبقہ کو نئے سرمایہ دارانہ نظام سے متعارف کرایا۔ دیہات میں بھی صنعتی نظام متعارف ہونے لگا۔ جاگیر دار زمین کو بیچ کر سرمایہ دار سے دوگنا منافع لے کر شہر کی طرف رخ کرتا ہے اور سرمائے کو منفی کاموں میں استعمال میں لا کر دوگنا منافع کماتا ہے۔ اس سے روزگار کے زیادہ مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ معاشرہ خوشحالی کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ ''نیرنگی'' میں جدید معاشی صورتحال کو ان الفاظ میں اجاگر کیا گیا ہے۔ ''کہیں شہر سے کافی دور جا کر رقبے سے کئی گناہ زیادہ رقبہ خریدیں گے اور بڑے زمین دار بن جائیں گے یا پھر اس سے بہت اچھا کاروبار کریں گے۔''(۶۱)

سائنسی ترقی نے کئی منزلیں طے کر لیں۔ صنعتوں میں وسعت پیدا ہوئی، انسان کی آسائش و آرام کے لئے طرح طرح کی ایجادات وجود میں آئیں۔ جمہوری آزادی سلب کرنے والی قوتوں کا زور ٹوٹ گیا لوگوں کے اندر شعور اجاگر ہو گیا۔ لوگوں نے جدید زرعی معیشت کو اپنا کر ملک و قوم کی ترقی میں مستحکم کردار ادا کیا۔ دیہاتوں میں لوگوں کا صرف ایک کھیتی باڑی کے پیشے سے منسلک ہونے کا رواج عام تھا لیکن جدید مشینی دور نے انسان کو مختلف پیشوں سے متعارف کرایا۔ جدید ذرائع آمدنی کو معاشروں میں متعارف کر کے لوگوں میں آگاہی پیدا کی کہ وہ کس طرح اپنے ذرائع معاش کو بہتر کر سکتے ہیں۔

اس طرح عصری دور نے دیہاتوں اور گاؤں کی معاشرت کو متاثر کیا۔ ان کو جدید عصری تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے پر راغب کیا۔ کسان، مزدور کے ذرائع آمدنی میں وسعت پیدا کی۔ لوگوں میں دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کا رجحان عام ہو گیا۔ وہاں کچھ سادہ شخصیتوں والے سیدھے سادے دیہاتی جب شہر میں آئے تو انہیں بہت سے نئے تجربات سے گزرنا پڑا۔ ان کو وہاں اپنی پسند، اپنی صلاحیت کے مطابق اپنی ذات کی تشکیل نو کرنے کے تمام مواقع میسر تھے۔ لوگ جدید زرعی معیشت کو اپنا کر صرف ملک کے لیے ہی مفید فرد کے

طور پر سامنے نہیں آئے بلکہ عالمی برادری میں بھی ملک و ملت کا نام سربلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح جدید شہری معاشرت نے انسان کو نئی سوچ عطا کی۔ انسان جدید زرعی معیشت کے حصول کی طرف راغب ہوا۔

شہر نے جہاں گاؤں کی تہذیب کو متاثر کیا وہیں بہت سے فوائد بھی سامنے آئے۔ لوگوں نے شہر کے قریب آنے والی سہولیات سے استفادہ کر کے زرعی معاشرے کو صنعتی معاشرے میں تبدیل کرنے میں مدد کی۔ دیہات میں لوگوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی اور گلہ بانی ہوتا تھا لیکن جدید مشینی دور نے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گاؤں کے معاشی نظام میں خاطر خواہ تبدیلیاں پیدا کیں۔ گاؤں کے لوگوں کو صنعت و حرفت کے شعبے سے وابستہ کیا۔ ان کے اندر کاروبار کرنے کا جذبہ اجاگر کیا۔ گاؤں خوشحالی کی طرف گامزن ہو کر قصبوں اور شہروں میں بدلنے لگا۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے خوش آئندہ بات ہے۔ ''نیرنگی'' افسانے میں جاوید انور اپنے کردار کے ذریعے اس بات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ''شگفتہ میرے خیال میں تو یہ ہماری لاٹری نکلی ہے۔ اللہ نے ہمیں موقع دیا ہے کہ ہم گوبر اور پیشاب کی بو سے نکلیں اور بڑے لوگوں میں شامل ہو جائیں۔''(۶۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہات کے لوگوں میں شعور پیدا ہو چکا ہے۔ وہ جدید سہولیات سے فائدہ اٹھا کر اپنے ذرائع معاش اور طرز زندگی کو جدید طریقوں کے مطابق اپنانا چاہتے ہیں۔ اس طرح جدید معاشرتی دور نے انسان کے اندر شعور پیدا کیا۔ جاوید انور ''نیرنگی'' افسانے میں اس بات کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ''کوئی چھوٹا سا ٹرانسپورٹر بن گیا، کوئی پراپرٹی ڈیلر اور کوئی عمارتی سامان کا اسٹور ڈال کر بیٹھ گیا۔ پشتوں سے ایک ہی پیشے سے منسلک لوگ نئے نئے کاروباری تجربات پر لگ گئے۔''(۶۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اپنے آبائی پیشوں کو چھوڑ کر نئے جدید پیشوں کو اپنا کر زندگی کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جو کہ ایک خوش آئن بات ہے۔ گاؤں ترقی کر کے شہروں کے ساتھ لوگوں کی طرزِ زندگی میں واضح تبدیلیاں لایا۔ لوگ سرمایہ داری کی نئی نئی ٹرمز سے واقف ہونے لگے۔ آج کے عصری دور میں ایک دیہی بازار سے لے کر بلواسطہ اسٹاک ایکسچینج جیسے مختلف بازار وجود میں آگئے ہیں۔ یہ صرف بازار نہیں بلکہ سماجی ادارے ہیں، اس قسم کے اداروں سے سماج کے مختلف لوگ آپس میں مربوط ہوتے ہیں۔ جو آپس میں لین دین کے معاملات کرتے ہیں اور چھوٹے صنعت کار بڑے صنعت کاروں کے ہم پلہ آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح معاشی خوشحالی بڑھی۔ دیہات، شہروں کے ہم پلہ آنے کی تگ و دو میں گامزن ہیں اور اشیاء وخدمات کا لین دین عالمگیریت کے سبب بڑھنے لگا۔ جدید سرمایہ داری سے آگہی ہونے لگی جیسا کہ ''نیرنگی'' افسانے میں: ''گاؤں میں سٹاک ایکسچینج اور حصص کا نام بالکل اجنبی تھا۔ سٹہ بازی کا تو شاید کسی نے کبھی

خواب بھی نہ دیکھا ہو۔ وہ کیسی بلا ہے اور کیا گل کھلا سکتی ہے۔''(۶۴)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیہات اور گاؤں میں سرمایہ داری کا نام نہیں تھا۔ لوگ زرعی پیشے سے منسلک تھے۔ جب جدید مشینیں اور سائنسی دور سے سرمایہ داری کا چال چلن ہوا تو گاؤں کے بازاروں میں وسعت پیدا ہوئی۔ اشیا کا لین دین مقامی منڈی سے بین الاقوامی منڈی تک ہوا تو نئے کاروباری اداروں سے واسطہ پڑا۔ اس طرح مشینی ترقی نے جہاں معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لائیں، وہیں بہت سی پرانی قدروں کی شکست و ریخت شروع ہوئی۔ ماضی کی قدر اپنی اہمیت کھونے لگی ایک نیا طرز زندگی وجود میں آیا۔ ہر لمحہ نئے سماجی تقاضے تھے، ان تقاضوں کو پورا کرنے اور معاشرے میں رہنے کے لیے لوگوں نے پرانی اقدار کو ترک کر کے نئے طریقوں کو اپنایا۔ پہلے لوگ بزرگوں کے تجربات سے استفادہ کرتے تھے لیکن آج کے جدید دور میں بزرگوں کے تجربات و مشوروں کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس کی بھاگ دوڑ نوجوانوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ افسانہ ''نیرنگی'' میں اس بات کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''اشرف اپنے والد کا مناسب سا احترام تو کرتا تھا لیکن اسے قائل کر چکا تھا کہ اب بدلتی ہوئی دنیا اشرف اور اس کے ہم عمر لوگوں کی ہے پچھلی نسل غیر متعلق ہو چکی ہے۔''(۶۵)

جدید تعلیم اور معاشرے نے پرانی اقدار کو بے معنی کر دیا۔ نوجوان بزرگوں کے تجربات سے استفادہ اٹھانے سے احتراز برتتے ہیں کیونکہ اس مشینی دور کے مسائل کو جدید طریقوں سے حل کرنا نوجوانوں کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ مشینی عہد ماضی میں نہیں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ نوجوان ہر قدم پر نئے تجربات اور نئے تقاضوں سے مجبور ہو کر مختلف سانچوں میں خود کو ڈھالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

لیکن جدید معاشرے میں پرانی اقدار کو فراموش کرنے کے باوجود ایک تنوع سامنے آتا ہے، جس میں فرد اپنی پسند اور صلاحیت کے مطابق اپنی ذات کی تشکیل نو کرتا ہے۔ جدید معاشرے کو صرف ایک طبقے کی سوچ پر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ معاشرے نے قدیم سے جدید کی طرف سفر کیا تو سائنسی ترقی سامنے آئی۔ صنعتوں میں وسعت پیدا ہوئی ہے زرعی پیداوار کے جدید طریقے سامنے آئے ہیں انسان کی سہولیات و آسائش کے لئے نئی نئی ایجادات سامنے آئی جو آج کے عصری تقاضوں کے لحاظ سے خوش آئن بات ہے۔

نتائج

جاوید انور نے اپنے افسانوں میں جدید طرز زندگی کی اخلاقی جہات اور جدید و قدیم کی کشمکش کو اپنے افسانوں میں بخوبی بیان کیا ہے۔ آپ نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی بدلتی ہوئی اخلاقی اقدار کو اجاگر کیا کہ کس طرح معاشرہ قدیم سے جدید کی طرف سفر کرتا ہے۔

جدید معاشرے کا انسان نے قدیم روایات سے انحراف کر کے جدیدیت کی طرف قدم بڑھایا، انسان کے رہن سہن کے طریقے بدل گئے، معاشرتی اقدار میں واضح تبدیلی سامنے آنے لگی۔ جاوید انور نے اپنے افسانوں میں ان تمام معاشرتی اقدار کا ذکر کیا جو آج کا عصری انسان فراموش کر کے جدیدیت کی بھیڑ میں خود کو گم کر بیٹھا ہے۔ آپ نے اپنے افسانوں میں بتایا کہ جدید انسان کس طرح سماجی و مذہبی اخلاقیات کو فراموش کر کے ماڈرنزم کا شکار ہے۔ آپ نے اپنے افسانے ''بھڑ'' میں ان تمام اخلاقی روایات کا ذکر کیا جن کو آج کی عصری انسان نے فراموش کر دیا ہے۔ ان میں صبح لیٹ اٹھنے کا رواج، ہر کام کے لئے نوکر کو بلانا، محنت کے جذبہ کو فراموش کر دینا، پیسے کی دوڑ میں تمام اخلاقی، سماجی اقدار سے روگردانی کرنا نمایاں ہیں۔

جاوید انور نے اپنے افسانوں میں بتایا کہ انسان سائنسی ترقی کے کرشمات میں اس قدر گم ہو چکا ہے کہ وہ اپنے اسلاف یا بزرگوں کے بتائے ہوئے طریقوں کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ جدید انسان سہل پسند ہو گیا ہے، محنت کی عظمت کا درس جو ہر دور میں دیا جاتا ہے آپ نے اپنے افسانوں میں بھی دیا اور اس کے ذریعے اسلامی اقدار کو بچوں سے روشناس کرایا۔ آپ نے بتایا کہ زندگی مسلسل حرکت کا نام ہے، انسان کی کامیابی مسلسل جدوجہد میں پوشیدہ ہے، زندگی کے بہت سے شعبوں میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔

انسان کے قیام وطعام، رسوم ورواج وغیرہ میں تبدیلی کا عمل ہے۔ آپ نے اپنے افسانوں میں ان تمام تبدیلیوں کا ذکر کیا کہ کس طرح مغرب کا لباس، پینٹ کوٹ، عصری صنعتی و سرمایہ دارانہ دور میں بین الاقوامی پہچان بن گیا۔ اسلامی معاشروں میں بھی پینٹ شرٹ کا چلن عام ہو گیا۔ قدیم معاشرے میں شلوار قمیض عورت کے لئے اس کی عکاسی کرتی لیکن آج کے جدید عصری دور میں خواتین پینٹ کوٹ کا استعمال کرتی ہیں۔

آپ نے اپنے افسانے ''غرض'' میں اس بات کو فریدہ کے کردار کے ذریعے اجاگر کیا کہ کس طرح وہ اپنی مشرقی تہذیب و تمدن سے بے پرواہ ہو کر جدید معاشرے کی پر اعتماد لڑکی میں ڈھل چکی ہے۔ آپ نے اپنے

افسانوں میں عصر حاضر کے دو طبقات کے رویے بھی سامنے لائے، جدید و قدیم کی کشمکش و سماجی اقدار ،دو خاندانوں کے درمیان دیوار کی مانند حائل ہو جاتی ہے۔ شہری اور دیہاتی معاشرہ ایک دوسرے کی اقدار کو قبول کرنے سے قاصر رہتا ہے اس طرح دو خاندانوں کے درمیان رشتے ناطے ختم ہو جاتے ہیں۔

دیہات کے معاشرے میں مذہبی اور سماجی اقدار کی اہمیت کو مد نظر رکھا جاتا ہے لیکن شہری معاشرے کا انسان ان تمام اقتدار سے بے پروا رہتا ہے۔ جاوید انور نے اپنے افسانے ''غرض'' میں قدیم و جدید کشمکش کو نہایت عمدگی سے اجاگر کیا۔ آپ نے بتایا کہ شادی جیسا اہم فریضہ کس طرح آج کا انسان بزرگوں کی رضامندی کے بغیر انجام دیتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے آپ نے جدید روایات اور قدیم اقدار کو اجاگر کیا ہے۔ معاشرے میں شادی بیاہ کی رسومات باقاعدہ معاشرتی و خاندانی طریقہ کار کے مطابق ہوتی تھیں۔ آج کا انسان تمام سماجی و اخلاقی اقدار سے نابلد ہے جبکہ انسانی زندگی میں اخلاقی اور مذہبی اقدار کا گہرا تعلق موجود رہتا ہے کیونکہ انسان کی زندگی میں افکار کا تعلق عقائد سے، عبادت کا شریعت سے، معاملات کا تعلق اخلاق سے ہوتا ہے۔

آپ نے اپنے افسانوں میں بتایا کہ تمام مسائل کا حل اخلاقیات پر منحصر ہے۔ پہلے دور میں لوگوں کے پاس ٹیکنالوجی کی آسائشات میسر نہیں تھی لیکن ان کے اندر اخلاقی اور مذہبی اقدار راسخ تھیں۔ آپ نے ان تمام باتوں کو اپنے افسانے کے کردار دین محمد کے ذریعے اجاگر کیا ہے جو اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے سمجھ بوجھ والا انسان ہے۔ جو ناپ تول میں امانت دار ہوتا ہے آپ نے بتایا کہ ہمارا جدید معاشرہ شدید اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔ جدید طرز زندگی انسان کو تمام اخلاقی اقدار سے غافل کر رہی ہیں۔ لیکن جدید دور کی دوڑ میں دین محمد کی دکان بڑے بڑے سٹور کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کی ایمانداری عصر حاضر کی تبدیلی کے سامنے دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

جہاں جدید دور میں انسان کی ضرورتوں میں اضافہ کیا وہیں بہت سے مسائل اور آسانیاں بھی سامنے آئیں۔ جدید دور نے جاگیر دارانہ نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام کا آغاز کیا، لوگ غلامی سے نکل کر سرمایہ دار کے پاس اجرت پر کام کرنے لگے۔ لوگوں کے اندر شعور بیدار ہوا، صنعتی و تجارتی مراکز میں تیزی آنے لگی ہفتے میں معاشی اور معاشرتی تبدیلی رونما ہونے لگی، اسی طرح صنعتی و تجارتی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا جس نے قدیم وجدید کے مابین کشمکش کو جنم دیا۔ لوگوں نے قدیم سے جدید کی طرف سفر کیا تو بہت سے معاشی معاشرتی سیاسی اور ادبی لحاظ سے تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ اس طرح انسان کی تہذیب و تمدن کی تبدیلیوں کے ساتھ انسان کی ذہنی صورت حال پر بھی گہرا اثر پڑا۔ جس نے اس کے سوچنے کے انداز شخصی اور اجتماعی طرز زندگی کو بھی متاثر

کیا۔ انسان جن تہذیبی و ثقافتی رویوں کو منظم کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے وقت کے ساتھ ان میں تغیر و تبدل ہو رہا ہوتا ہے۔ ان تبدیلیوں کے باعث انسانی ذہن مثبت اور منفی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔

جاوید انور نے اپنے افسانوں میں جدید و قدیم کی کشمکش کے زیر اثر پیدا ہونے والی تمام نفسانی مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے اپنے افسانے نیرنگی میں بتایا کہ کس طرح شہر کی بڑی عمارتیں گاؤں کی ہریالی کو نگل رہی ہیں۔ صنعتی معاشرے کی اپنی ٹیکنالوجی ہوتی ہے لیکن اس ٹیکنالوجی کے زیر اثر انسانی زندگی میں معاشرتی اضطراب، سماجی مزاحمت، نفسیاتی ابتری پیدا کر کے معاشرے کی ساخت کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح آپ نے بتایا کہ کس طرح صنعتی انقلاب نے دیہات کی فضا کو متاثر کیا۔ گاؤں کے ذرائع آمد و رفت کے ذرائع میں تبدیلیاں آئیں، تانگے کی جگہ چنگچیر رکشے نے لے لی، گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کا استعمال عام ہو گیا، شور شرابا ماحولیاتی آلودگی جیسے مسائل پیدا ہوئے۔ ان تمام مسائل کے ساتھ ٹیکنالوجی کی آمد نے وقت کے فاصلوں کو سمیٹ دیا لیکن وہیں بہت سے صحت کے مسائل فضائی آلودگی کے سبب پیدا ہوئے۔

انسان دمہ اور سانس کی بیماریوں میں مبتلا ہوا، اس طرح صنعتی ترقی نے جہاں انسان کو سہولیات دیں وہیں کچھ مسائل بھی پیدا کیے لیکن شہر کی پیش قدمی نے گاؤں کی ترقی کے دروازے کھول دیے۔ جدید ذرائع آمد و رفت کے سبب معاشرے میں تبدیلیاں ان لوگوں کی سوچ بدلنے لگی لوگوں کے اندر تعلیم حاصل کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ خواتین جو گھر کی چار دیواری میں قید رہتیں تھیں جن کا کام گھر کی دیکھ بھال کرنا اور گھریلو فرائض سرانجام دینا ہوتا تھا وہ لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ اس طرح جدید معاشرے نے عورت میں تعلیمی شعور دیا گاؤں کے بہت سے مسائل کو حل کرنے میں مدد دی، گاؤں کا معاشرہ جو اونچ نیچ، ذات برادری کے چکر میں جاگیرداروں اور وڈیروں کی غلامی کا شکار تھا جاوید انور نے ایسے طبقے کی عکاسی اپنے افسانے میں کی کہ جدید دور میں کس طرح انسان اس غلامانہ سوچ سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے اور اپنے حقوق و فرائض سے آگہی حاصل کرتا ہے۔

بہتر آمدنی انسان کو نقل و حرکت کی طرف مجبور کرتی ہے انسان دیہات سے شہر کی طرف آنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ بہتر زندگی اپنا سکے۔ اپنے ''نیرنگی'' افسانے میں غریب طبقہ جو احساس کمتری کا شکار ہو کر زندگی کی آسائشات و سہولیات سے محروم ہوتا ہے، معاشرے میں معاشی طور پر خود کفیل ہوا یہ تبدیلیاں سرمایہ دار سماجوں کے مرہون منت ہیں۔ اس طرح عصری دور نے دیہاتوں اور گاؤں کی معاشرت کو متاثر کیا اس طرح شہر نے جہاں گاؤں کے تہذیبی ماحول کو متاثر کیا وہیں بہت سے فوائد بھی سامنے آئے۔

حوالہ جات

۱۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۹۶۵

۲۔ William Raymond, key words, pg 46,47

۳۔ The New EncylopediaBritannica,Vol 16,2003,pg 42

۴۔ Allans.F,wesber's new illustrated dictionary, INC publishers New York Washington, D.C, 1970, Pg 628

۵۔ Lewis Numford, The Culture Of Cities, Harcovil Brace And Company,New York, 1938, pg 423

۶۔ صبا اکرام، جدید افسانہ چند صورتیں، فکشن گروپ آف پاکستان، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳

۷۔ خورشید عالم، اردو افسانوں میں گاؤں کی عکاسی، نیشنل پبلک ہاؤس، نئی دھلی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۹۶۔۹۷

۸۔ سجاد حیدر یلدرم، اگر میں صحرا نشیں ہوتا، مشمولہ خیالستان، مکتبہ جامعہ، دھلی، س۔ن، ص ۲۷۸

۹۔ عمارہ طارق، ڈاکٹر، اردو افسانے میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہر، ماہنامہ فانوس، لاہور، جلد ۵۶، شمارہ نمبر ۱، جنوری ۲۰۱۶ء

۱۰۔ منشایاد محمد، دنیا کا آخری بھوکا آدمی، مشمولہ وقت سمندر، گورا پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۲

۱۱۔ منشایاد محمد، ایک کنکر ٹھہرے پانی میں، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۲۰۷

۱۲۔ جاوید انور، شیر، مشمولہ برگد، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۷۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۸۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۳

۱۷۔ مبارک علی، تاریخ اور عورت، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸

۱۸۔ جاوید انور، شیر، مشمولہ برگد، ص ۸۱

۱۹۔ خالدہ حسین، دشمن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۵

۲۰۔ جاوید انور، دشت و وحشت، مشمولہ برگد، ص ۹۸

۲۱۔ مبارک علی، تاریخ اور عورت، ص ۱۸

۲۲۔ جاوید انور، دشت و وحشت، مشمولہ برگد، ص ۱۰۵

۲۳۔ جاوید انور، پیر شناس، مشمولہ برگد، ص ۱۴۹

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۲۵۔ جاوید انور، نظر بد، مشمولہ برگد، ص ۱۱۷

۲۶۔ ایضا، ص ۱۱۷

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۲۸۔ جاوید انور، غرض، مشمولہ برگد، ص ۱۳۱

۲۹۔ جاوید انور، بھڑ، مشمولہ برگد، ص ۱۱۷

۳۰۔ جاوید انور، فیک، مشمولہ سرکتے راستے، ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۶۴

۳۱۔ ایضاً، ص ۷۰

۳۲۔ ایضاً، ص ۷۲

۳۳۔ امجد طفیل، برگد سے سرکتے راستے تک (مضمون)، مشمولہ سرکتے راستے، ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء ص ۲۴

۳۴۔ جاوید انور، فیک، مشمولہ سرکتے راستے، ص ۷۲

۳۵۔ شہزاد منظر، ادب میں انتہا پسند رجحانات، مشمولہ ماہ نامہ فنون، مدیر احمد ندیم قاسمی، لاہور، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۴

۳۶۔ جاوید انور، بھڑ، مشمولہ برگد، ص ۱۱۸

۳۷۔ جاوید انور، دشت و وحشت، مشمولہ برگد، ص ۹۵

۳۸۔ جاوید انور، بھڑ، مشمولہ برگد، ص ۱۱۶۔۱۱۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۴۲۔ جاوید انور، غرض، مشمولہ برگد، ص ۱۳۱

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۴۴۔ ایضاً، ۱۳۳

۴۵۔ ایضاً، ۱۳۲

۴۶۔ایضاً، ۱۳۲

۴۷۔جاوید انور، بھڑ، مشمولہ برگد، ص۱۱۸

۴۸۔جاوید انور، بارِ زیست، مشمولہ سرکتے راستے، ص۹۷

۴۹۔گوپی چند نارنگ، فکشن شعریات تشکیل و تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص۳۱۷

۵۰۔جاوید انور، بارِ زیست، مشمولہ سرکتے راستے، ص۹۸،۹۷

۵۱۔جاوید انور، نیرنگی، مشمولہ سرکتے راستے، ص۱۲۲

۵۲۔ایضاً، ۱۲۷

۵۳۔جمیل احمد عدیل، جاوداں کہانیاں (مضمون)، مشمولہ سرکتے راستے، جاوید انور، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص۱۶

۵۴۔جاوید انور، بارِ زیست، مشمولہ سرکتے راستے، ص۹۸

۵۵۔ایضاً، ص۹۸

۵۶۔جاوید انور، نیرنگی، مشمولہ سرکتے راستے، ص۱۲۳

۵۷۔ایضاً، ص۱۲۳

۵۸۔ایضاً، ص۱۲۳

۵۹۔ایضاً، ص۱۲۳

۶۰۔ایضاً، ص۱۲۴

۶۱۔ایضاً، ص۱۲۵

۶۲۔ایضاً، ص۱۲۵

۶۳۔ایضاً، ص۱۲۹

۶۴۔ایضاً، ص۱۲۹

۶۵۔ایضاً، ص۱۲۹

باب سوم

جاوید انور کے افسانوں میں سیاسی صورت حال کی عکاسی

الف: سیاسی زندگی کے اجتماعی طبقاتی مسائل

i. سیاست

لفظ ''سیاست'' کے لغوی معنی ملک کی حفاظت و نگرانی، حکومت و سلطنت، نظم و نسق کے ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے اس کا مفہوم حکمت و دانائی کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے۔ قومی انگریزی لغت میں سیاست کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> ''سیاست سے مراد حکومت کاری کا علم، کسی حکومت، قوم یا کسی مملکت کی حکمت عملیاں اور مقاصد، سیاسی جماعتوں کے طور طریقے اور ان کے مقابلے، سیاسی معاملات کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد، ان لوگوں کی ریشہ دانیاں یا منصوبہ بندیاں جو ذاتی طاقت، شان و شوکت، منصب یا اسی قسم کے دیگر مقاصد کے جویا ہوں۔''(۱)

سیاست کا تعلق بھی انسان کی معاشرتی و سماجی زندگی سے ہے۔ انسان نے جب معاشرے میں مل جل کر رہنا سیکھا تو اس کو ایک ایسے نظام کی ضرورت پیش آئی جس پر عمل پیرا ہو کر کسی خطے میں رہنے والے مخصوص گروہ یا افراد اپنے اجتماعی زندگی احسن طریقے سے گزار سکے۔ اس نظام یا ضابطے کو متعلقہ لوگوں پر اطلاق کے لئے کسی طاقت یا قوت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عوام میں سے ہی کچھ لوگ مقتدرہ قوت بن کر سامنے آتے ہیں۔ یہی مقتدر لوگ اقتدار کے بعد امور کی انجام دہی کے ذمہ دار ٹھہرتے ہیں جو کاروبار سلطنت سے متعلق ہوتے ہیں۔

سیاست ایک اجتماعی عمل ہے معاشرے کا کوئی بھی فرد اقتدار کے حصول کے اس عمل کا حصہ بن سکتا ہے۔ اقتدار کا حصول بہت سے لوگوں کی خواہش ہو سکتی ہے مگر لازم نہیں کہ سب ہی اقتدار کی قوت حاصل کر سکیں۔ لیکن جو لوگ اقتدار کے ایوانوں میں نہیں پہنچ پاتے وہ اہل اقتدار کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی اچھائیوں اور برائیوں کو عوام کے سامنے لاتے ہیں۔ صاحب اقتدار عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ قوانین بناتے ہیں، پہلے سے موجود قوانین پر عمل کرتے ہیں۔ معاشرے کے فرد کی حیثیت سے ریاست کا شہری اپنی ریاست کے طریقہ حکمرانی میں بعض ترامیم اور تبدیلیوں کا متمنی ہو سکتا ہے کیونکہ ریاست کے ہر شہری کے ذہن میں سیاست

سے متعلق کوئی نہ کوئی ویژن یا خاکہ موجود ہوتا ہے۔

اس سیاسی بصیرت کے پیش نظر اپنے وقت کی سیاسی سر گرمیوں میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔اس طرح تمام افراد یا ریاست کے شہری کسی نہ کسی طرح نظام سیاست میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔اس علاقے میں معاشرتی سطح پر مجموعی رویے کو پیش کرتی ہے اور عوام و خواص کی بہتری فلاح و بہبود کا کام سرانجام دینے کی کوشش کرتی ہیں ۔سیاست کو انسانوں اور انسانی قدروں کا مرکب سمجھا جاتا ہے جس میں زمان و مکان کی حدود موجود ہوتی ہیں۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ سیاست کے معنی و مفاہیم میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔تاہم مجموعی طور پر سیاست کو عوام کی ایک انتظامی قوت کا نام دیا جائے تو بجا ہوگا۔یہ انتظامی قوت وقت کے ساتھ ساتھ حالات کے مطابق ترتیب دی جاتی ہے۔بقول اسٹیفن سینڈر: ''سیاست کا مقصد سیاست نہیں بلکہ تمام محرکات ہے جن پر مملکت کے سیاسی ڈھانچے کے اندر عمل کیا جاسکتا ہے۔''(۲)

لہذا آج کے عصری دور میں خاص طور پر ادبی نقطہ نظر سے سیاست کے مفہوم کے اندر بہت سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوگئی ہیں۔اسی طرح ارسطو کے نزدیک ''سیاست ایک علم بھی ہے اور ایک فن بھی۔'' گویا سیاست ایک انسانی زندگی کا ایسا طریقہ کار ہے جو کسی معاشرے، ریاست یا علاقے میں کاروبار حکومت کو سنبھالے اور سیاسی عمل میں عوام اور ریاست کا ایک باہم تعلق پیدا کرے۔سیاست اپنے حقیقی معنوں میں ایک مضبوط قوت ہے جو انسانوں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک خاص راہِ عمل اختیار کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ارسطو نے اپنی کتاب پولیٹکس(Politics) کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے کہ انسان فطری طور پر ایک سیاسی حیوان ہے۔ارسطو نے معاشرتی زندگی کی روح کو سیاست میں پنہاں کر دیا ہے کیونکہ معاشرے کے بغیر انسانی زندگی کا تصور محال ہے۔اس طرح سیاسی معاشرے کے بغیر بھی انسانی زندگی ادھوری ہے کیونکہ ریاست کی رکنیت اختیار کیے بغیر کوئی بھی فرد تہذیب و تمدن سے واقفیت اور سیاسی بصیرت حاصل نہیں کر سکتا۔کیونسی رائٹ(Quincy wright) ایک ممتاز سیاسی مفکر ہے اس نے بھی سیاست کو فن سے جوڑا ہے۔''جس کے ذریعے کچھ گروہوں کو متاثر کر کے سبکدوشی سے گٹھ جوڑ یا کنٹرول کر کے دوسروں کی مخالفت میں کسی ایک گروہ کے مقصد کو فروغ دیا جاتا ہے۔''(۳)

سیاست کا تعلق عملی زندگی سے ہوتا ہے۔چیئرمین موزئے تنگ بھی سیاست کے عملی زندگی سے متعلق ہونے کے دعویدار ہیں کیونکہ سیاست ایسی جنگ ہے جو خون خرابے کے بغیر لڑی جاسکتی ہے۔اس طرح سیاست ایک ایسا عمل ہے جس میں لوگ اجتماعی طور پر فیصلے لیتے ہیں۔یہ عام طور پر حکومت یا ریاستی امور کو چلانے کا فن یا

سائنس ہے۔یہ حکومتی معاملات میں طور طریقوں یا رویے کو بیان کرتا ہے۔تاہم سیاست دوسرے باہمی معاملات میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جیسے کہ تعلیمی یا مذہبی اداروں میں حکام بالا یا طاقت کے معاشرتی تعلقات شامل ہوتے ہیں اور یہ سیاسی اکائی معاشرتی تعلقات کو بھی شامل کرتا ہے۔اس کے علاوہ پالیسی بنانے اور لاگو کرنے کے طریقے اور قوانین شامل ہیں۔

آج کے جدید دور میں ادبی نقطہ نظر سے سیاست کے مفہوم میں بہت سے معانی پنہاں ہیں۔جب ادب کے تناظر میں سیاست کی بات ہو تو سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا جاتا ہے کیونکہ سیاست سماج کے تمام پہلوؤں کو براہ راست یا بالواسطہ متاثر کرنے کا موجب بنتی ہے۔

ii. ادب اور سیاست کا تعلق

ادب اور سیاست دونوں کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی سے ہے۔دونوں کی بنیاد معاشرے کی دین ہے۔ادب اپنے عہد کے حالات و واقعات کو بہترین الفاظ میں بہترین حسن ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اپنے دور کی عکاسی عمدہ انداز میں کرتا ہے۔ادب میں زندگی کی تمام گوناں گوں خصوصیات، چاہے وہ سماجی سیاسی یا معاشی ہو، شامل ہوتی ہیں۔ادب میں سیاست اس وقت جلوہ گر ہوئی جب زبان کو ادب کا درجہ ملا۔ادیب اور ذہنی آزادی،ادب اور سیاست کا تعلق اس دور کا اہم سوال ہے۔ادیب کے ہاں سیاست کے اثرات بڑے واضح نظر آتے ہیں۔ژال پال سارتر جو فرانسیسی مفکر ہے اس نے ادب اور سیاست کے آپس کے رشتے کے حوالے سے سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ :''سیاسی عمل کو ایک ایسی دنیا کی تعمیر کرنی چاہیے جس میں ادب آزادی کے ساتھ آزادی کی فضا میں اظہار کر سکے۔ادب آزادی کے اظہار کی ایک حقیقی صورت ہے۔''(۴)

سارتر نے سیاسی عمل کے متعلق یہ بات واضح کی ہے کہ سیاست اکثر اوقات ایسی دنیا کی تعمیر نہیں کرتی جس میں ادب کے اظہار کو آزادی حاصل ہو لیکن ادب اور سیاست کے موضوعات کو ہمیشہ ناقدین ادب نے بطور موضوع ڈسکس کیا ہے کیونکہ سیاسی اتار چڑھاؤ سے معاشرتی حالات و واقعات کو بہت زیادہ متاثر کرتے ہیں۔

سماجی حالات ادب کو خام مواد مہیا کرتے ہیں۔ادب نے انسان کے اندر تنقیدی احساس پیدا کیا تو ادیب نے معاشرے کے حالات و واقعات کو ابہام سے نکال کر عصری زندگی اور عوام سے قریب رہ کر جانچنا شروع کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''ادب میں سیاست کی بھی اتنی ہی گنجائش ہے جتنی فلسفے یا مذہبی اخلاق کی۔مگر ادب کا طریقہ کار سوال کرنے، سوالیہ نشان بنانے، مسئلے پیش کرنے سے زیادہ سروکار رکھتا ہے۔جواب یا حل

سے کم اور سیاست یا فلسفے یا مذہب کو حل کرنے کی فکر ہوتی ہے۔"(۵)

ادب پر سیاست کے اثرات ہمیشہ سے ہر دور میں موجود رہے ہیں جیسے بر صغیر کی تحریک آزادی، روس میں اشتراکی نظام، عالمی سطح پر موجود وطن پرستی و فسطائی رجحانات اور پھر جنگ عظیم کی وجہ سے ادب پر سیاست کے اثرات تیزی سے پھیلنے لگے۔ اس طرح ادیب پر سیاست کے اثرات بعض دفعہ لوگوں کو کھٹکنے بھی لگے لیکن اس کی حقیقت سے نظریں چرائی بھی نہیں جاسکتی ہیں۔ بقول راجندر سنگھ بیدی: "ادب سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک پامال مضمون ہے اور یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے سیاست سے۔"(۶)

بیسویں صدی میں سیاست کے ادب پر بڑے واضح اثرات پائے جاتے ہیں۔ اردو ادب پر بھی سیاست نے اپنے اثرات چھوڑے۔ اس دور میں سیاست نے ادب پر اپنے اثرات کے واضح نقوش چھوڑے ہیں کیونکہ اس دور میں انسانی زندگی کا دار و مدار سیاست پر تھا۔ اگر زندگی کو سیاست کے مترادف کہا جائے تو بجا ہوگا۔ ادب کا موضوع انسانی زندگی ہے۔ ادب کو سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرنے کی سعی بھی عالمگیر رجحان ہی کا نتیجہ ہے۔

ادیب معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ ادیب اپنے ارد گرد کے سیاسی ماحول سے متاثر ہو کر اپنے تاثرات کو ادب میں جگہ دیتا ہے۔ ادیب ان حالات و واقعات کو ادب کا موضوع بنا کر ان کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ عوام کو موجودہ سیاسی حالات و واقعات سے آگاہی فراہم کرنے کا بھی موجب بنتا ہے۔ ادیب آپ کے تمام خارجی اور داخلی کیفیات کو ادب کے سانچے میں ڈھالنے کا ذمہ دار ہوتا ہے کیونکہ انسانی زندگی ہر وقت بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر سیاسی حالات و واقعات سے متاثر رہی ہے کیونکہ سیاست کے بغیر ملک کا انتظام وانصرام چلانا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے سیاست زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرتی ہے ہمارا تمام نظام سیاست سے متاثر ہوتا ہے۔

ادب ہمیشہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور اپنے معاشرے کی اقدار اور کلچر کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ اسی طرح مارکسی نکتہ نظر سے سماجی نظریے کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ ادب کا تعلق تمام شعبوں سے مستحکم ہوا۔ جس نے ان نظریات کی ترویج میں مدد فراہم کی۔

New Germ Writer کی تحریک نے ادب کو معاشرے اور سیاست سے منسلک کر دیا۔ اس طرح جہاں جہاں انقلاب آیا وہاں کا ادب مثالیت سے بغاوت کر کے مادیت کی طرف بڑھا۔

ہر دور میں ادیب کے خیالات، نقطہ نظر اور معاشرے سے اس کا بندھن مختلف نوعیت سے جڑا ہوتا ہے۔ اس ذہنیت کا کوئی نام نہیں ہوتا لیکن آگے چل کر یہ بندھن سماجی اور سیاسی شعور کو اجاگر کرتا ہے۔ اس لیے ادیب قدرت کی ودیعت کی ہوئی اس صلاحیت کو بروئے کار لانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اپنی قوم اور معاشرے کے حالات،

چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی، اپنے قلم کے ذریعے ان کو اجاگر کرتا ہے کیونکہ جب کوئی شخص خود کو ادیب کہتا ہے تو اس کے ہاں ایک واضح ادبی شعور ہوتا ہے۔ یہ ادبی شعور ایک مرکب عمل ہے اس ادبی شعور کے پس پردہ میں ادیب کی ذاتی ملکیت، سماجی اور بین الاقوامی حالات بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے بھی ادیب اپنے زمانے کے حالات سے بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے۔ وہ سماجی رویوں، حالات و واقعات کو نا صرف دیکھتا اور محسوس کرتا ہے بلکہ اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنا کر اسے لوگوں کی زندگیوں سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس ضمن میں وارث علوی لکھتے ہیں:

> ''فنکار کا اپنی عصری زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اور اگر اس کی عصری زندگی کے مسائل بنیادی طور پر سیاسی ہیں تو یہ مسائل بھی اس کے ادب میں جھلکتے ہیں۔ انسانوں سے الگ سیاست کا کوئی وجود نہیں۔ ادب کا تعلق انسانوں سے ہے اور اس لیے ادب میں سیاست بھی انسانوں کے وسیلے ہی سے آتی ہے۔'' (۷)

انسانوں سے الگ نہ سیاست کوئی وجود رکھتی ہے نہ ادب کا وجود قائم رہ سکتا ہے۔ اس لیے ادب اور سیاست سمیت زندگی کے ہر شعبے کا محور و مرکز انسان ہے اور سیاست انسانی زندگی کا ایک شعبہ ہونے کے باوجود ایک غالب قوت کی حامل ہے۔ سیاست سے زندگی میں فرار حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے ادیب کی ادبی و فنی روشن مستقبل کے لئے سیاسی مستقبل راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ادب کے سیاست پر اثرات کے اظہار کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ ادیب اپنے معیار کی بلندیوں سے اتر کر غیر ملکی سیاست پر غور کرے کیونکہ ادب اور سیاست کا رشتہ بتا رہا ہے کہ ادب کو سیاست سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں جو سیاست سے متاثر نہ ہو۔ مذہب کو بھی سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے اگر کوئی انسان بازار سے سوئی خریدتا ہے تو اس کے پس منظر میں بھی سیاست کا ایک سمندر رہوتا ہے۔

ادب کو زندگی کی کسی بھی سرگرمی سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ادب کو زندگی کا ترجمان مانا جاتا ہے۔ ادب اور سیاست کو زندگی کا حصہ گردانا جاتا ہے۔ سیاست ایسی قوت ہے کہ زندگی کے پہلو میں شامل ہو کر اسے متاثر کرتی ہے۔ اس لیے ادب اپنے ارد گرد کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے۔ ادب اور سیاست اپنے چند متفرق اصولوں کے باعث ایک دوسرے سے فرار حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ ادب اور سیاست آج کے اس دور میں اس قدر گل مل گئے ہیں کہ ان کو الگ کرنا دشوار گزار عمل ہے۔ سیاست سے الگ ہونا زندگی سے الگ ہونے کے مترادف ہے۔ ادب اور سیاست کا آپس میں بڑا مربوط تعلق ہے۔ ابراہیم جلیس کے نزدیک: ''موجودہ زمانے میں سیاست ادب سے الگ نہیں ہو سکتی۔ سیاست اور ادب ایک دوسرے کے جزو لاینفک ہیں۔''(۸)

مختصر یہ کہ ادب پر آس پاس کے اثرات اور خاص طور پر سیاسی اثرات اپنے نقش مرتب کرتے ہیں۔ کوئی بھی شاعر یا ادیب اپنے عصری عہد سے بیگانہ ہو کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا ہے۔ادیب اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ ادب کا سماج سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے۔ادب پر اس کے عصری دور کی تحریکات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ادب عوام کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ زندہ ادب عصری شعور کی کوکھ سے ملتا ہے اور تخلیق پانے کے بعد اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے اور مستقبل کے لیے لائحہ عمل کا نمونہ بن کر سامنے آتا ہے۔

سیاست زندگی کا ایک اہم ستون ہے اس سے سیاست کو زندگی سے علیحدہ کرنا ناممکن بات ہے۔ادب زندگی کے تمام شعبوں کو زیر بحث لاتا ہے۔ سیاست زندگی کا ایک اہم شعبے کا درجہ رکھنے کی وجہ سے ادب پر اثرانداز ہوتا ہے اس لیے ادب کا سیاست سے الگ رہنا قطعی ناممکن ہے۔

iii. جدید اُردو افسانے میں سیاسی شعور

اسی (۸۰) کی دہائی برصغیر پاک و ہند میں جدید ٹیکنالوجی کی دہائی تھی۔اس عہد میں عوام پر عقلی و فکری مظالم ڈھائے گئے، جس کی وجہ سے سماج کا اصل روپ مسخ ہو گیا۔ دہشت، بے چینی، خوف، عدم استحکام عوام میں پیدا ہو گیا، کیونکہ اس عہد میں ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء اور ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی نے قومی زندگی کو بہت متاثر کیا۔ مختلف ادیبوں اور عوام نے ان تمام واقعات کی مذمت کی اور بہت سے ادیبوں اور مصنفوں نے نظم و نثر میں ان واقعات کو بیان کیا۔ آمرانہ حکومت کی ناانصافیوں کو لوگوں کے سامنے لایا گیا جس سے اُس دور کی آمرانہ حکومت نے بہت سی پابندیاں لگانے کی کوشش کی لیکن اُس عہد کے افسانہ نگاروں کے خوف، دہشت، بے یقینی اور اعتمادی کی لہر نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس سے ادب میں ہر بات کا کھل کر اظہار ہونے لگا۔

اس عہد میں افسانہ نگاروں نے بے باکی کا روّیہ اختیار کرتے ہوئے ان موضوعات کی عکاسی کی جس میں فرد اپنی تلاش میں مصروف ہے۔اسی طرح نوّے (۹۰) کی دہائی اور اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں اُردو افسانے نے معاشرے کی سیاسی و سماجی اور معاشی حقائق کو بنایا۔ان موضوعات میں ایٹمی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال، جدید ٹیکنالوجی کے اثرات، کراچی میں دہشت گردی کے واقعات، خودکش حملے، ۱۹۹۹ء کا مارشل لاء، نائن الیون کا واقعہ، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال جیسے واقعات کو اُردو افسانے نے بیان کر کے تاریخ کا حصّہ بنایا۔

جنرل ضیاء کا مارشل لاء (۱۹۷۷ء) اور جنرل مشرف کے مارشل لاء (۱۹۹۹ء) میں بنیادی فرق جبر و تشدد کا

تھا۔ مشرف کا مارشل لاء بظاہر پُرسکون ماحول برقرار رکھے ہوا تھا۔ آزادی اظہار کا حق ہر فرد کو دیا گیا۔ کسی قسم کی جبری پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔ لیکن مارشل لاء نے معاشرے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا، کیونکہ جمہوریت کی بدترین شکل آمریت کی بہترین شکل سے بہتر ہوتی ہے۔ نائین الیون کے واقعہ نے پاکستان کی عوام میں جبر، دہشت، تشدد کا خوف، اور پر سرار احساس پیدا کیا۔ جس کا اظہار اُردو افسانے میں کیا گیا۔ اسی مارشل لاء کے دور میں ۲۰۰۷ء میں بے نظیر بھٹو کے قتل نے اس خوف اور دہشت کی ایسی فضاء پیدا کی کہ عوام بے چینی، دہشت، خوف اور کشمکش کی کیفیات میں ایسی دوچار ہوئی کہ بعد میں جمہوری حکومت آئی لیکن وہ بھی اِس فضاء کو نہیں بدل سکی۔ اُردو کے افسانہ نگاروں نے اِن تمام واقعات کو افسانے کا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم اس دور کے افسانے کے حوالے میں لکھتی ہیں:

> ''اُس مارشل لاء کے خلاف شدید لہر اُٹھی احتجاج کی یہ لہر جس قدر مسلسل اور شدید تھی کہ شاید پہلے نہ تھی۔ اِس عہد کے دوران سب سے زیادہ ضرورت آزادی اظہار تھی اِس لیے اس دور کے افسانے میں گھٹی گھٹی آوازوں اور حبس کے موسموں کا بہت ذکر ہے نئی نئی علامتوں اور استعاروں کے تجربے سامنے آئے۔ فن کار کے تخلیقی ذہن اپنے اظہار کے لئے نئے وسیلے تراشے، مزاحمتی ادب اور علامتی ادب کی کئی کئی مثالیں قائم ہوئیں۔''(۹)

اس عصری عہد میں جدید رجحانات کے تحت لکھنے والے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، رشید احمد، خالدہ حسین، اسد محمد خان، مسعود اشعر، مرزا حامد بیگ، احمد داؤد اور احمد جاوید وغیرہ شامل ہیں۔ اِن تمام ادیبوں نے سیاسی شعور کی ترجمانی کرتے ہوئے بالواسطہ طریقے سے ایسے الفاظ کا چُناو کیا کہ جس میں پاکستانی سیاست کی مکروہ شکل واضح ہو جاتی ہے۔ احمد جاوید نے اپنے افسانے ''سُن تو سہی'' میں جاگیر داری نظام کی مکروہ شکل کو سامنے لائے جو عوام کو سیاسی چالوں اور ناچاقیوں کے باعث مجبور کرتا ہے اور اُن کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اقتدار سے کوئی سروکار نہیں صرف عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن عوام اِس جاگیر داری نظام کے آمرانہ ہتھکنڈوں سے بیزار ہو چکے ہوتے ہیں۔ اِس نظام کا خاتمہ چاہتے ہیں لیکن وہ عوام کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عوام کو قیامت کی نشانیاں بتاتا ہے اُن کو باور کراتا ہے کہ عوام کا وجود جاگیر داری نظام کے مرہون منت ہے۔ اگر وہ ختم ہو جائے تو عوام بھی نہ رہے گی۔ معصوم عوام بار بار اُن کی باتوں میں آکر بے وقوف بن جاتی ہے۔ یہ افسانہ ان الفاظ پر آکے ختم ہوتا ہے۔ ''وہ اُٹھا اور اُٹھ کر بند دروازوں پر دستک دینے لگا شاید اُس کو جواب ملتا

۔باہر دھوپ ہے،۔لو چلتی ہے،دھوپ ڈھلنے دو،ہوا چلنے دو،تم کہنا ہم سنیں گے۔"(۱۰)

اس افسانے میں عوام کی آواز کو دبایا جارہا ہے۔اُن کی سوچ کو ناپختہ کرنے کے لئے بے حس و حرکت بنادیا گیا۔اِس میں افسانہ نگار نے انقلابی پیغام دے کر اپنی بیداری کا ثبوت دیا ہے۔اعجاز راہی جو کہ ایک باشعور افسانہ نگار ہیں۔اُنہوں نے اپنے افسانے "سہیم ظلمات" میں آمرانہ حکومت کے رویّوں کو بے نقاب کیا ہے۔آمرانہ منافقوں کو عوام کے سامنے لایا جو عوام کو احتجاجی روّیہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

> "افسوس اب ہمیں تجربوں کے خوفناک آسیب کی ناکام عمل دہرانے سے نہیں روک سکتے۔ہم جو اپنی سرزمین کو بار بار مسخ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔قطب شمالی کی سفید بھیڑوں کی طرح آنکھ جھپکنے کے کسی موقع کو خالی نہیں رہنا چاہیے۔کبھی نہیں"(۱۱)

اس عہد میں معاشرے کی سیاسی جبریت معاشی بدحالی،سیاسی استبداد اور سماجی زندگی کے منفی رویّوں کو اُجاگر کیا۔افسانہ نگار مظہر الاسلام نے اپنے افسانے "کاندھے پر کبوتر" میں سیاسی جبریت کا بیان کیا ہے۔کہ ایک بچّہ سکول سے جب گھر آتا ہے تو اُسے سارے دروازے بند ملتے ہیں،وہ بہت چلاتا ہے۔لیکن کوئی دروازہ نہیں کھولتا،گھر کا چوکیدار جو گھر کی حفاظت کے لئے رکھا گیا تھا وہ خود گھر پر قبضہ کر لیتا ہے۔یہی رویہ حکمرانوں کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔افسانے میں اس بات کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> "چوکیدار کُرسی پر اکڑ کر بیٹھا ہوا تھا اور اُس کا دھڑ بھیڑیے کے دھڑ میں تبدیل ہو گیا تھا۔اُسے یقین نہ آیا تو اُس نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر پسینہ خشک کیا۔آنکھیں ملیں اور پھر صحن میں جھانکا،چوکیدار واقعی ہی بھیڑیا بن چُکا تھا۔اور کُرسی کے قریب ایک چوہا کوئی چیز کتر رہا تھا"(۱۲)

اِس طرح منصور قیصر نے بھی اپنے افسانے میں اس عہد کے جبر و استبداد کو بیان کیا کہ حکمران طبقہ کس طرح عوام کی آواز دبانا چاہتا ہے۔حق و صداقت کے لئے بولنا یا احتجاج کرنے پر پابندی عائد تھی۔لیکن زیادہ دیر تک عوام کی آواز کو نہیں دبا سکے اور سچائی کو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔"جب قانون کے لفظ سیسے کی طرح پگھلنے لگے تو اُن میں انسانی خون ٹپکنے لگتا ہے اور انسانی جسم کے جلنے کی بو آنے لگتی ہے"(۱۳)

اس طرح انور سجاد نے بھی اپنے افسانوں میں اپنے عہد کی سیاسی صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔آپ نے مارشل لاء کی جبری کیفیتوں کی عکاسی کی ہے جو انسان کو خون برباد کرنے کے درپے رہیں۔انسان کی بے بسی اور

ذہنی کشمکش جیسی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔اُن کے افسانوں میں انسانی استحصال کی عکاسی ان الفاظ میں بیان کی گئی۔ ''ظالم کا چہرہ کتنا مظلوم کیوں نہ دکھائی دے اُس پر کندہ ظلم کی تحریر کبھی نہیں مٹتی، جادو سے آزاد انسان اس تحریر کو پڑھ کر ہمیشہ کھکھلا کر ہنس دیتے ہیں۔''(۱۴)

آپ کے افسانوں میں سیاسی و سماجی زندگی کا شیرازہ بکھیرہ ہوا نظر آتا ہے۔انتظار حسین جو جدید افسانے کے علامتی اور تمثیلی رویوں کے اوّلین افسانہ نگار ہیں۔اُن کے افسانے موجودہ عہد کی ترجمانی کرتے ہیں۔انتظار حسین نے اپنے مجموعے ''کچھوے''میں سیاسی صورت حال کی عکاسی کر کے اپنے عہد کے سیاسی زوال کو بیان کیا ہے۔اس مجموعے کے افسانہ ''کچھوے''میں سیاست دانوں اور سیاسی رہنماوں کو جو بے عملی کے عیب کو طویل تقریروں کے پرتو میں چُھپا دیتے ہیں۔انتظار حسین نے اُن کو ''کچھوے''قرار دیا ہے۔اُن کے افسانے ''کشتی''میں بھی سیاسی صورتِ حال پر شدید قسم کی مایوسی چھائی ہے۔آپ نے اپنے افسانے ''کشتی''کا حوالہ دے کر پاکستان کی سیاسی صورتحال کو حضرت نوحؑ کے عہد سے مماثل کر کے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی ہم اپنی منزل کا تعّین نہیں کر سکے وہ مقصد حاصل کرنے سے قاصر رہے ہیں جس کی خاطر پاکستان بنایا گیا تھا۔آج کے جبری حکمرانوں کی بدولت آج بھی حالتِ سفر میں ہی ہیں۔

> ''کتنے دن کتنے برس سے کتنی صدیوں سے بارش اور سفر میں یہ ہوتا ہے، لگاتار برسے تو لگتا ہے کہ برس برس سے یہ برس رہا ہے اور برس برس یہ برسے گا۔سفر کے بیچ کوئی پڑاؤ نہ آئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنم جنم سے سفر میں ہیں۔''(۱۵)

اس کے علاوہ اُن کے افسانوں میں پنجرہ، جل گرجے، بخت ماری، گھوڑے کی نداو غیرہ میں بھی سیاسی شعور کی عکاسی کی گئی ہے۔آپ نے جہاں آمرانہ طاقتوں کی ناانصافی پر قلم اُٹھایا ہے، وہیں جمہوری اداروں کی تباہی اور کھوکھلے پن کو بھی اُجاگر کیا ہے۔آپ نے اپنے اردگرد کی زندگی پر جبریت اور بے معنویت، بے چینی کو گہرے سیاسی شعور اور ایک منفرد تہذیبی احساس کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔رشید امجد کے افسانوں کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔آپ نے مذہب، سیاست، اخلاق، نفسیات اور ادب وغیرہ پر قلم اُٹھایا ہے۔آپ نے اپنے عصری عہد کے مارشل لاء کی پابندیوں کی بھیانک صورت کو اُجاگر کیا ہے۔کیونکہ اُن کے عہد کے انسان حکم زبان بندی کے پابند تھے۔اُن کو اظہار کے لیے کوئی راستہ میسر نہیں تھا۔خوف، بے چینی، دہشت، عدم تحفظ کا احساس فرد کا ذاتی نہیں اجتماعی مسئلہ بن گیا۔اُن کے افسانے ''الجھاؤ''میں مارشل لاء کے دور میں بھٹو کی پھانسی کو تاریخی واقعہ کے طور پر تجربہ اور صداقت کی کسوٹی پر بیان کیا ہے۔

''یہاں تک کے سچ بولنے والی آنکھیں اور دوسروں کے لئے بولنے والی زبان باہر آگئی۔ مدتوں سے یہ پھندا خالی تھا۔ بیر گیں ویران ہو گئیں تھیں اور اس سارے کو تحفظ دینے والی دیوار جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھی''(۱۶)

آپ نے ۱۹۷۷ء کے بعد کے افسانوں میں موت، جنازہ، اندھیرا، قبریں جیسی استعارات استعمال کر کے آمریت کی بھیانک شکل کو عوام کے سامنے لائے۔ آپ نے فرد کی بے بسی، بے یقینی، وجود کی گم شدگی کو محسوس کرتے ہوئے افسانہ ''پت جھڑ'' میں مارے گئے لوگوں کے نام تحریر کیے ہیں۔ اس میں عصری صورتحال کی اذیت ناکی کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''درخت، قبریں، راستے سب گم ہو گئے ہیں، جس دیوار پر میں بیٹھا ہوا ہوں وہ بھی کھو گئی ہے مجھے اپنا آپ بھی نظر نہیں آرہا ہے، صرف سوچ سکتا ہوں، میں چیختا ہوں، مگر میری آواز اندھیرا ہے۔''(۱۷)

اسی طرح ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوں میں ملک کی سیاسی و سماجی اور معاشی حقائق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مارشل لاء کے جبر و تشدد نے اُن کے لہجے میں تندی و تلخی بھر دی ہے۔ اِس ضمن میں اُن اہم افسانے، جب راج کرے گی خلق خُدا، شہر کا پہلا محب وطن بچّہ، کہانی کون لکھے، شہید کا خواب، آخرت ایکسپریس، پہلے سے سُنی ہوئی کہانی، وغیرہ شامل ہیں۔ اُن کے افسانے ''شہید اور خواب'' میں شہید ہونے والا فرد گھوم پھیر کر معاشرے کی صورتِ حال کا جائزہ لیتا ہے۔ اس افسانے جنرل ضیاء کے ریفرنڈم کا ذکر بھی موجود ہے۔ کس طرح جھوٹے بہانوں سے صدارت لیتا ہے اور اسلام معاشرے میں پھیلانے کے لیے غیر فطری طریقوں کو اپناتا ہے تاکہ لوگ یہ سمجھے کہ ضیاالحق معاشرے میں اسلام پھیلانے آیا ہے۔ لوگ اُس کو قبول کریں۔ خود نام نہاد مسلمان ہو کر مولویوں کے ذریعے لوگوں کو زبردستی اجتہادی بنانے کا عمل جاری رکھتا ہے۔ جو لوگوں کو دُنیا و آخرت میں بخشوانے کا وعدہ کیے ہوئے تھے لیکن شہید گھوم پھیر کر حالات کا جائزہ لیتا ہے تو اُس کو اندازہ ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ ہوتا ہے۔

اس افسانے میں آپ نے لوگوں کے اندر یہ احساس جگانے کی کوشش کی ہے کہ آمرانہ حکومت یہ سب سیاسی ہتھکنڈے جو عوام کو گمراہ کر کے تباہی کے دہانے پر کھڑا کرتے ہیں۔ معاشرہ اندرونی طور پر تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ''آخرت ایکسپریس'' میں بھی ضیاالحق دور میں بنائی جانے والی پالیسی کا منظر نامہ ملتا ہے کہ لوگوں کے اندر

جہاد اور قربانی کا جذبہ پیدا کیا جائے، لوگوں کی ''آخرت ایکسپریس'' کی تیاری میں امداد امریکہ سے لی جاتی ہے ۔لوگوں کی قربانی اور جہاد کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

''وزیر اعظم نے بے چینی سے وزیر مذہبی اُمور کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ بجٹ پیکج آپ مکمل کریں گے، قوم کو قربانیوں کے لئے تیار کرنا ہے۔اس میں اسلام کا فلسفہ قربانی ڈال دیجیے۔(۱۸)''

اس طرح لوگوں کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کیا گیا، لوگوں کی قربانیاں رائیگاں گئیں جو معاشرے کی سیاسی و سماجی صورتِ حال پر گہرا طنز ہے۔مارشل لاء کے جبر کے حوالے سے زاہدہ حنا نے بھی قلم اُٹھایا۔آپ کے افسانے ''پتلیاں ڈھونڈنے والی''، ''رنگ تمام''، ''خون شدہ''، ''آخری بوند کی خوشبو''، شامل ہیں۔شاد باد نے بھی اپنے افسانوں میں ضیا الحق دور کی ریاکاری اور معاشرے کی بڑھتی ہوئی منافقت کو موضوع بنایا۔اُن کے افسانے ،''اوور ٹائم''، ''دُنیا کو آخری بھوکا آدمی''، ''کہانی رات کی''، ''شب چراغ''، ''روکی ہوئی آوازیں''، ''زوال سے پہلے'' وغیرہ شامل ہیں۔افسانوں میں آمریت کے دور میں دُنیا کے جاہ و طلب کے پجاری اور ظالموں کے روّیوں کی عکاسی بھی کی گئی ہے جو حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر اسلام اور علم کو توڑ کر پیش کرتے ہیں۔اپنے مفاد کی خاطر عوام کی قربانیوں کو استعمال کرتے ہیں۔خالدہ حسین کا ناول ''مکڑی'' بھی مارشل لاء عہد کی عکاسی کرتا ہے۔آپ نے مارشل لاء کے عہد کو تار عنکبوت بنا کر پیش کیا جس میں ہمارا عہد قید ہے۔اس جبر استحصال کی دُنیا سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔ ''مکڑی تو کوئی اور ہے، جس نے یہ جالا بُنا ہے اس کو تار تار تنا ہے اور میں اُسی کا شکار اُس کے نرم ریشمیں تانے بانے میں اُتر آیا ہوں اور باہر نہیں دیکھ سکتا۔''(۱۹)

عرش صدیقی نے بھی مارشل لاء کے عہد کو اپنے افسانوں ، باہر کفن سے پاؤں، مور کے پاؤں ، ظلِ الٰہی، ہم نشینی کا عذاب وغیرہ میں بیان کیا ہے مارشل لاء کے اِس جبری عہد میں جتنے بھی لوگوں نے لکھا۔اُنہوں نے اپنی تخلیقات میں اُس عہد کی جبریت، مایوسی، اجنبیت، شکست وریخت، حزن و ملال کو بیان کیا ہے اور آمریت کے مکروہ مقاصد کو عوام کے سامنے لائے۔آزادی اظہار کی پابندیوں کی پرواہ کیے بغیر آمرانہ سازشوں کو بیان کیا۔

اسی طرح اکیسویں صدی میں جدید ٹیکنالوجی کے دور میں ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان نے چاغی کے مقام پر ایٹمی دھماکے کیے تو انسان دوستی کے جذبے سے سرشار ادیبوں نے اِس کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ۔احتجاجی فضاء نے پُوری دُنیا کا ہلا کر رکھ دیا۔اِس ضمن میں انتظار حسین کے افسانے ''میرے اور کہانی کے بیچ'' اور

''مورنامہ''، آصف فرخی کا ''خواب میں سفر''، طاہر آفریدی کا ''گیارہ اٹھائیس''، امیر جلیل کا ''عجیب و غریب موت''، منصور قیصر کا ''سورج کی آواز''، گوہر ملک کا ''بلوچ نے مجھے دھکا دیا'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر افسانے ہیں۔اِسی طرح افسانہ ''ریزرو سیٹ'' میں انتظار حسین نے دہشت گردی اور موت کا منظر دیکھاتے ہیں۔اِس افسانے میں بڑی بو کا خواب بیان کیا گیا کہ سیٹ اُن کے لئے ریزرو ہونی تھی وہ اُن کے پوتے کے لئے ریزرو ہو جاتی ہے۔اُن کا نوجوان پوتا مسجد میں دہشت گردوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔اس طرح اس خواب میں دہشت کی فضاء پیدا کر دی جاتی ہے۔ بڑی بو جو کے ماضی کی علامت ہے لیکن آج کے عصری عہد میں دہشت گردی کے مسائل کا سامنا کرتی نظر آرہی ہے۔ ''مسجد میں ابھی صف کھڑی ہوئی تھی کہ کچھ مشٹنڈے منہ پر ڈھائے باندھے کلاشنکوف تانے اندر گھس آئے اور نمازیوں کو بھون ڈالا۔کتنے تو مسجد سے سر ہی نہ اٹھا سکے۔''(۲۰)

اِسی طرح اٹیمی دھماکوں کے خوف و دہشت کے تناظر میں مرزا مبین کا افسانہ ''خواب باوا آدمی'' بھی اہم ہے۔اِس افسانے میں مرکزی کردار اٹیمی دھماکوں سے نفسیاتی طور پر متاثر ہوتا ہے۔وہ اٹیمی دھماکوں کے بعد بچے کی پیدائش کو منحوس قرار دیتا ہے۔اِس نفسیاتی کشمکش میں وہ اپنی مردانگی کھو دیتا ہے۔

> ''میں سوچنے اور سمجھنے کے بعد اِس نتیجے پر پُہنچا ہوں کہ دُنیا خراب ہو چکی ہے۔یہ کسی امن پسند اور محبت کرنے والے آدمی کے لائق نہیں رہی۔سیاست دانوں اور اٹیم بمبوں کی دُنیا میں اپنی اولاد کو لایا، اُس کے ساتھ بدترین ظلم ہے۔''(۲۱)

اِن اٹیمی دھماکوں کی بدولت کراچی کے حالات ابتر صورت حال کا شکار ہو گئے ہیں۔دہشت گردی کے واقعات، سٹریٹ کرائم، جبر و تشدد، فسادات، سیاسی وابستگیوں کی بنیاد پر قتل و غارت، اِن تمام واقعات نے شہر میں خوف و ہراس کی فضاء قائم کر دی۔ جس سے فرد نفسیاتی طور پر متاثر ہوا ہے۔کراچی کے حالات کے پیش نظر الطاف فاطمہ کے افسانے ''ذہن کا اقلیدسی زاویہ'' اور ''جب دیواریں گریا کرتی ہیں''۔ان افسانوں میں زندگی کی جبریت، خوف، بے چینی، اضطراب کو بیان کیا گیا ہے۔ ''پہلے لوگ چل کر میدانِ شہادت کو جاتے تھے۔اب شہادت خود چل کر بستیوں اور سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں آتی ہے۔''(۲۲)

امراؤ طارق نے بھی کراچی کے حالات پر قلم اُٹھایا ہے۔آپ کے افسانے ''کرفیو کی ایک رات''، ''سّچے گیت''، ''چھوٹے لوگ'' وغیرہ شامل ہیں۔اِس طرح کراچی کی سیاسی صورت حال بھی عدم استحکام کا شکار ہو گئی ہے۔اپنی سیاسی گروپوں کی مخالفت کی وجہ سے آئے دن حالات کشیدہ ہوتے گئے۔بیروزگاری عام ہو گئی، نوجوان

موت کے منہ میں جانے لگے۔مرزا مبین کے افسانے ''سفید پردہ''میں معاشرے میں ہونے والی سیاسی نا انصافیوں کواُجاگر کیاہے۔نوجوان بیروزگاری سے عاجزہو کر جرائم کی دُنیاکی طرف چلاجاتاہے۔اُس کے لئے واپسی کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔اِس افسانے کامرکزی کردار خود کو حالات کے سُپرد کر کے ایم کیوایم کی پارٹی کو جوائن کرلیتاہے۔دہشت گردی کی زندگی کواپناتاہےاور آخر میں سیکیورٹی فورسز کی گولیوں سے لقمہ اجل بن جاتاہے۔

اِس طرح کے ملکی حالات کے دوران امریکہ میں نائن الیون کا واقعہ پیش آتاہے۔اِس واقعہ سے براہ راست پاکستان کا کوئی تعلق نہیں تھالیکن اِس واقعہ نے پاکستان کی دفاعی نوعیت کو متاثر کیا۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کرنے والوں میں پاکستان ملوث نہیں تھالیکن پاکستان اِس حملے سے براراست متاثر ہوا۔امریکہ کاافغانستان پر حملہ کرنے میں پاکستان کا ساتھ دینابہت سے مسائل کو سامنے لایا۔بہت سی مذہب تنظیموں کواِس کاخمیازہ بھگتناپڑااور پاکستان دہشتگردی کی جنگ کی زد میں آگیا۔اُردوافسانہ نگاروں نے تمام حالات وواقعات کوافسانوں کاموضوع بنایا ۔اِس ضمن میں ڈاکٹر رشیدامجد لکھتے ہیں۔

> ''اُردوافسانہ چاہے آزادی اظہار کے مسائل ہوں مارشل لائی جبر کے حالات ہوں یہاں تک کہ نائین الیون اوراُس کے بعد کی صورتحال ہو تمام عصری مسائل کو عصری آگہی کے ساتھ پیش کیا۔''(۲۳)

نائین الیون کے حوالے سے مسعود مفتی کاافسانہ ''شناخت''نمایاں حیثیت کاحامل افسانہ ہے۔یہ افسانہ ۲۰۰۲ء میں شائع ہو تھا۔اس افسانے میں مرکزی کردار کی زندگی نائین الیون کا واقعہ کے بعد بدل جاتی ہے۔۔وہ امریکی تہذیب کادالدہ ہوتاہے۔مذہب کی گرفت سے آزادامریکی لڑکی فین سے شادی کرلیتاہےاور اپنے بچّوں کوہر طرح کی مذہبی اور ذہنی آزادی دینے کا قائل ہوتاہے۔اُس کے دوست احباب اُس کو سمجھاتے ہیں لیکن وہ اُن کا مذاق اُڑاتاہے۔اِس دوران اچانک نائین الیون کا واقعہ پیش آجاتاہے۔جس کے بعد حالات ایسے بدلتے ہیں کہ امریکیوں کامسلمانوں کے ساتھ ناانصافی پر مبنی رویہ اُس کودُکھ دیتاہے۔اِس بدسلوکی سے گھبراکراپنے وطن پاکستان کی طرف لوٹتاہے تُواُس کے والدین اور عزیزواقارب خوش دلی سے اُس کو ملتے ہیں اور تبھی اُس کو باپ کی موت کی خبر دی جاتی ہے تو وہ بہت افسردہ ہوجاتاہے۔اُس کے اندر کی کیفیات بدلنے لگتی ہیں اور وہ اپنی اصلی شناخت کی طرف لوٹ آتاہے۔

> ''میں پہلے پاکستان کا شہری تھا،اِس ملک نے مجھے رد کردیا۔پھر بنگلہ دیش کا شہری بنا تو وہاں کے

حالات نے مجھے رد کر دیا، اب امریکہ کا شہری ہوں تُو اِس کی نئی فضاء مجھے رد کر رہی ہے۔ نہیں معلوم کہ میں کہاں کا شہری ہوں۔ اتنی وسیع دُنیا میں اتنا تنہا آدمی میری زندگی کا بیلنس سیٹ بھی کتنا عجیب ہے۔''(۲۴)

اِس طرح افتخار نسیم کا افسانہ ''پردیسی'' بھی ایسے ہی شناخت کے گرد گھومتا ہے۔ اِس افسانہ کا مرکزی کردار اپنی شناخت ۱۹۴۷ء کے فسادات میں کھو دیتا ہے۔ ایک آدمی اُس شخص کو بچا کر اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے اور بچہ ہندو ہے کہ مسلمان یہ جانے بغیر اُس کی پرورش کرتا ہے۔ جب وہ آدمی اِس دُنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اُس کا بڑا بھائی اُس کا گھر سے نکال دیتا ہے۔ نائن الیون کا واقعہ کے بعد امریکیوں کا رویہ بھی بڑے بھائیوں والا ہو جاتا ہے۔ اُس کو امریکہ سے نکل جانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ جیسا کہ،

''اسلم پر بچپن سے لے کر اب تک کیا کیا نہیں گزر رہی مگر آج اُس کو ڈرگ سٹور کی پارکنگ لائٹ میں جاتے ہوئے کار میں کسی امریکی آواز آئی

Go back to your mothercountry(25)

اِس طرح اِس عہد میں بہت سے لوگ نائین الیون کے بعد عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اِس طرح امریکہ میں مقیم پاکستانی اپنی اصل کی طرف لوٹنے پر مجبور ہوئے۔ اِس افسانے میں امریکہ کی مکروہ شکل سامنے لائی گئی جو عالمی دُنیا میں انسانی حقوق کا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ تمام انسانوں کو برابر کے حقوق دینے کے قائل تھا۔ خود انصاف کے تقاضوں سے بہت دور تھا۔ امریکی مسلمانوں کو اور پاکستانیوں کو اس حقیقت کا ادراک گیارہ ستمبر کے فوراً بعد ہوا۔

اِس طرح حمید شاہد کی ''سورگ میں سور'' تمثیلی انداز میں پیش کی گئی۔ اِس افسانے میں ایسی بستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی رہائشیوں کو بکریوں کا ریوڑ پالنے کا خاص شغف تھا۔ وہ اِس کو پاک کام گردانتے تھے۔ مگر جنگلی سوروں کی حفاظت کے لئے اُن کو کتے پالنے پڑے مگر کتے بھی اِن سوروں کے ساتھ مل گئے۔ اس کہانی میں سیاسی حکمرانوں کا استبدادی طاقتوں کے ساتھ مل جانے کا احوال تمثیلی پیکر میں پیش کیا گیا۔ اِس طرح پروین عاطف نے اپنے افسانے ''اینڈ آف ٹائم'' میں ایٹمی جنگ کے بعد افغانستان کی اور وہاں کی حالتِ زار کو بیان کیا ہے۔

''نعشوں کے سرنڈنے پوری فضاء ناقابلِ برداشت کر دی۔ سائیں سائیں کرتے بد نما خلا اور ساری مخلوق جس کا ہونا نہ ہونا بے معنی تھا۔ نہیں وقت کی موت برداشت نہیں۔ شیطان نے

ایک بار بازی جیتی دوزخ کی آگ سے انسان تو مر سکتا ہے ،وقت نہیں ،وقت نہیں ، وقت نہیں۔ ''(۲۶)

اُردو افسانے گیارہ ستمبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال میں امریکیوں کی مذمت ، عراق اور افغانستان کے حالات اور اُن حالات کے پاکستانی معاشرے پر اثرات کو موضوع بنایا۔اِسی طرح افسانہ نگار علی حیدر ملک نے اپنے افسانے ''دہشتگرد چُھٹی پر ''میں نائین الیون کے بعد معمولاتِ زندگی میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کی عکاسی کی ہے کہ بیرونی دہشت گردوں سے زیادہ ملک کی عوام کی حفاظت پر معمور ادارے فرد کو شک کی نگاہ سے دیکھتے اور عوام کا استحصال کرتے۔اِس افسانے میں مرکزی کردار جمیل شیرازی ایک مذاکرے میں اِس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں کہ دہشت گرد چھٹی پر ہیں۔یہ فقرہ مذاکرے میں اپنی تقریر کے دوران ادا کیا مذاکرہ کا موضوع تھا ''دہشتگردی،اسباب،اور تدراک کی تدابیر ''جس کا انتظام ایک این۔جی۔او،نے کیا تھا۔اُردو افسانے نے گیارہ ستمبر کے بعد پیدا ہونے والی تمام سیاسی ، معاشی، ثقافتی حالات کو بیان کیا۔اِس صدی میں اُردو افسانہ نہ صرف جغرافیائی حدود کے اندر زندگی کا ترجمان تھا بلکہ بین الاقوامی سیاسی، سماجی حالات، کو بھی بیان کیا۔اِس ضمن میں ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہے۔

''یہ ایک نئی طرح کا مزاحمتی رجحان ہے، جیسے ہم اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں مشکل ہوتا دیکھ رہے ہیں۔یہ مزاحمت بیک وقت کئی محاذوں پر سر اُٹھا رہی ہے۔سب سے بڑا اور سر گرم محاذ تو بڑی طاقتوں کی دھونس، دھمکی آمیز رویے،اقتصادی،سیاسی، تہذیبی استحصال اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھانے کی شعبدہ بازی کے خلاف ہے،اُردو افسانہ بین الاقوامی سطح پر اُٹھنے والے طوفان اور اُس کے عوامل سے بے خبر ہے،نہ بے نیاز۔''(۲۷)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو افسانہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور جغرافیائی تناظر سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔اسی طرح انیس ناگی کا افسانہ ''سایہ ''میں سیاسی حوالے سے ہونے والی کرپشن دکھائی گئی ہے۔اسی طرح مجسمہ ساز طارق محمود کا، ''چھ چیکا بیس''،اشفاق احمد کا ''سن تو سہی''،احمد جاوید جاوید کا ''جواں مرگ کا نوحہ ''یہ وہ افسانے ہیں جن میں بار بار حکومتوں کی تبدیلی نظر آتی ہے۔پاکستان کے سیاسی استحکام پر طنز کی صورت میں یہ افسانے لکھے گئے ہیں، جہاں حکومتی بار بار بدلتی ہیں وہ لوگوں کے اندر عدم احساس تحفظ کے رجحانات جنم لیتے ہیں۔ حکومتوں کے بدلنے سے ہر نیا آنے والا حکمران اپنی پالیسیاں ساتھ لے کر آتا ہے، جس کی وجہ سے عوام بہت زیادہ

متاثر ہوتی ہیں۔ان کے اندر احساس تحفظ کے خدشات جنم لینے لگتے ہیں اس حوالے سے ڈاکٹر راحیلہ بشیر لکھتی ہیں۔

> ''اکثر افسانہ نگاروں کے ہاں پاکستان کو ایک عمارت یا ایک قلعے سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے اس میں بسنے والے عجیب و غریب قسم کے خوف میں مبتلا ہیں۔ عدم تحفظ کا احساس، نفسیات، مذہب اور فلسفہ کی نظر میں شر ہے۔''(۲۸)

سیاست سے طاقت کا تصور لیا جاتا ہے۔عوام حکمران کا انتخاب کر کے اس کو حکومت میں لاتے ہیں تو حکمرانوں کو بھی اس بات سے آگاہ ہونا چاہئے کہ عوام کا تحفظ ضروری ہے۔اپنی ریاست میں اپنی عوام کے حقوق کا خیال رکھے۔افسانہ نگاروں نے حکمران طبقہ کی اس سیاسی ذمہ داری کے حالات کو اپنے افسانوں میں بخوبی بیان کیا ہے۔مثلاً اسد محمد خان کا افسانہ ''وارث''، انور زاہدی کا افسانہ ''ادھڑی ہوئی سڑک''، امراؤ طارق کا ''کرفیو کی رات''، غلام عباس کا ''دھنک''، مظہر الاسلام کا ''کندھے پر کبوتر'' اور ''اے خیام کا چیستان'' وغیرہ شامل ہیں۔

اسی طرح آزادی رائے پر بھی افسانہ نگاروں نے قلم اٹھائے کہ ہر شخص کو اپنی رائے دینے کا پورا حق ہے مثلاً آزادی رائے اور دیگر موضوعات پر لکھے جانے والے افسانوں میں جاوید اختر کا ''مگر تم زندہ رہنا''، خدیجہ مستور کا ''محافظ ملک''، زاہدہ حنا کا ''جسم و جاں کی موت سے پہلے''، سلیم اختر کا ''عذاب میں گرفتار''، رشید امجد کا ''تماشا عکس تماشا'' اور مرزا حامد بیگ کا افسانہ ''رہائی'' وغیرہ ہیں۔ان افسانوں میں ملکی پالیسیوں اور قانون وضوابط کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

iv. جاوید انور کے افسانوں میں سیاسی زندگی کے اجتماعی طبقاتی مسائل

ادب اور سیاست کا ہر دور میں بہت اہم مقام ہے۔فرد، ادب، ریاست اور سیاست کا تعلق ہر زمانے کے ادب میں موجود ہوتا ہے۔آج کے عصری دور میں جاوید انور نے بھی اپنے افسانوں میں سیاسی صورتحال کی عکاسی نہایت اچھوتے انداز میں کی ہے۔جاوید انور نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کی سیاسی صورتحال کے چند گوشوں کو اجاگر کیا ہے کہ آج کی سیاست میں عوام کو کن کن مسائل کا سامنا ہے۔کس طرح اعلیٰ طبقہ آج کے جدید دور میں بھی جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے میں ناکام ہے۔اس دور میں بھی طبقاتی تقسیم موجود ہے۔یہ طبقاتی تقسیم مذہب، سیاست، معاشرت ہر طرف کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

جاوید انور نے اس تقسیم کو اپنے افسانے ''برگد'' میں بیان کیا ہے کہ ایک غریب کی بیٹی جب نمبردار کے

بیٹے کو پسند کرتی ہے لیکن ان کی پسند میں طبقاتی فرق آجاتا ہے اور اچھو جو نمبر دار کا پتر ہوتا ہے اس کو ڈومنی گامن میراثن یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ میرا تیرے ساتھ کوئی میل نہیں ہے۔

''تجھے کیا نکالنا ہے مجھ سے اچھو جی! میں ڈومنی تو نمبر دار کا پتر نمبر دار۔ اچے شملے والا۔ کیا کمی ہے تیرے پاس کسی بھی چیز کی؟ لڑکیاں ایک جھلک دیکھنے کو سو سو بہانے کرتی ہیں۔ نہ اپنا پینڈا کھوٹا کر نہ مجھے امتحان میں ڈال۔ شاواشے۔ اپنی قسمت اپنا اپنا نصیب۔''(۲۹)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی طبقاتی فرق روا رکھا جاتا ہے۔ دیہاتی کلچر میں قسمت کے فیصلے مالی اور خاندانی حیثیت دیکھ کر کیے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ میں آج بھی رنگ، نسل، ذات پات، روپیہ، پیسے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ڈومنی میراثن اپنی حیثیت دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے کیونکہ جاگیر دار اور زرعی مزدور کے درمیان طبقاتی کشمکش حائل ہے۔

غریب طبقہ ہمیشہ جاگیر دار طبقہ کے استحصال کا شکار رہتا ہے۔ غریب مزارعے اپنے ذاتی فیصلوں میں بھی آزاد نہیں ہوتے ہیں۔ جاگیر داروں کا رعب و دبدبہ نچلے طبقوں کو ذہنی غلام بنا دیتا ہے۔ اس لیے غریب اپنی اولاد کے فیصلوں میں آزاد نہیں ہوتا۔ اس بات کی عکاسی افسانہ ''برگد'' میں ایک اور جگہ ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''اچھو! تجھے میری مجبوری کی قسم بچ جا۔ نہ تین جانیں مار۔ میرے ابے پر ترس کھا۔ بھلے بندے پر ہزاروں بار کی دوہرائی بالی جٹی کے تھیڑ کی کہانی نہ دوہرانہ دوہرا۔''(۳۰)

اس اقتباس میں گامن میراثن کی بے بسی دکھائی جاتی ہے کہ جو اس قدر بے بس ہے کہ اچھو کو چاہتے ہوئے بھی پیچھے ہٹنے کا کہتی ہے کیونکہ وہ اپنے اور اچھو کے درمیان ذات پات اور اونچ نیچ کے فرق کو سمجھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ آج کے اس دور میں بھی ایسے رویے کی جھلک کہیں نہ کہیں نظر آتی ہے۔ غلام بی بی عرف گامن میراثن افسانے میں بھی اپنی حدود اور حیثیت سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے لیکن پھر بھی بے درد معاشرے کے ظلم کا لقمہ اجل بن جاتی ہے۔ معاشرے میں طبقاتی استحصال کی تصویر گاماں میراثن کا گلا گھونٹ کر اور خاص الخاص میراثی بگے کو برگد پر لٹکا کر دکھائی گئی ہے۔ ''اندھیری حبس زدہ رات میں کسی نے گاماں کو گلا گھونٹ کے مارا اور کون بگے کی لاش کو روہی کے برگد پر لٹکا آیا۔''(۳۱)

اس افسانے میں جاگیر دار طبقہ کی ناانصافیوں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ کس طرح غریب طبقے کا استحصال کیا جاتا ہے۔ غریب طبقے کی جان، مال، عزت ان جاگیر داروں اور زمین داروں کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں ہے۔ سماج کے وہ ادارے جو عوام کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں وہ بھی جاگیر دار طبقہ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ ان کا

سماجی حکومتی اداروں پر رعب و دبدبہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ من مانی کرتے ہیں۔

اسی طرح ''بھٹی''افسانے میں بھی طبقاتی استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کس طرح سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھوں غریب طبقہ کا استحصال کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ طاقت کے نشے میں کھو چکا ہوتا ہے۔ تمام اخلاقی اقدار کھو چکی ہوتی ہیں، نچلے کام کرنے والے محنت کش طبقے کو برابری کے حقوق دینا سرمایہ دار طبقہ کی شان کے خلاف ہوتا ہے۔ معاشرے میں طبقاتی تقسیم بڑھتی جاتی ہے۔

''بھٹی''افسانے میں بھی جبر و استبداد کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ زندگی جو پر سکون سمندر کی طرح ہے جس میں بظاہر تو کوئی طغیانی نہیں لیکن پھر اچانک سے قتل ہو جاتا ہے زندگی کی بھٹی بجھ کر راکھ ہو جاتی ہے گاؤں کی پر سکون فضا میں افسردگی اور خاموشی چھا جاتی ہے۔ یہ قتل سائیکل خریدنے کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے بلکہ سرخ اینٹوں والے چھدرے پردے کے پیچھے جو سایہ غائب ہوتا ہے وہ چوہدری کی بیٹی کا ہے۔ جس ٹریکٹر ٹرالی پر سلامت کی لاش کو لایا جاتا ہے وہ بھی چودھری کا ہے۔ یہ قتل غیرت کے نام پر ہوتا ہے۔ ایک غریب محنت کش گھرانے کے بیٹے کا قتل صرف اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ ان کی بیٹی غریب گھرانے کی بہو نہ بننے کی فرمائش کرے تو وہ ادنیٰ طبقہ کے سلامت کو قتل کر کے اس بات کا خدشہ ہی ختم کر دیتے ہیں۔ ''بھٹی سے گھٹی گھٹی چیخیں اور دلدوز آہیں نکلیں، دھواں اور آگ ملے پانی کی ناخوشگوار مہک پر خوشبو غالب آگئی اور پورے گاؤں پر سوگ پھیل گیا۔''(۳۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھوں غریب کا استحصال ہوتا ہے۔ سلامت تو اس بات سے آگاہ بھی نہیں ہوتا لیکن چودھری اپنے عزت اور انا کا مسئلہ بنا کر اپنی بیٹی کی پسندیدگی کے شک کی بنیاد پر بے دردی سے ایک زندگی کو کچل دیتا ہے زندگی کی بھٹی کو بجھا دیتے ہیں۔ افسانہ ''بھٹی'' کے ضمن میں ظفر اقبال ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''جاوید انور نے آگ اور پانی دو متضاد سماجی طبقات سکھ اور دکھ کے درمیان ایک ایسی پر اثر پر سوز لکیر کھینچی ہے کہ آنے والے کئی برسوں تک لوگ انہیں بھٹی کا خالق کہہ کر یاد کریں گے۔''(۳۳)

ہمارے معاشرے میں آج تک جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ جاگیر دارانہ سوچ میں تکبر کا عنصر نمایاں ہوتا ہے اور یہ طبقہ معیشت پر پوری طرح قابض ہوتا ہے۔ ملک کی ساٹھ فیصد آبادی ان جاگیر داروں اور وڈیروں کی غلام ہوتی ہے۔

اس لیے جاگیر دار طبقہ غریبوں میں احساس کمتری کے جذبات کو ہوا دیتا ہے تاکہ یہ لوگ کبھی ان کے

سامنے سر نہ اٹھا سکے اور عوام ان جاگیر داروں کی ذہنی غلام بن چکی ہوتی ہے۔ وہ اپنی جاگیر داروں اور وڈیروں کو آنکھیں بند کر کے ووٹ دے کر منتخب کرتے آئے ہیں۔ اس طبقے نے ملک اور عوام کا استحصال کیا اس استحصال کی بھینٹ زیادہ تر مزدور اور غریب کسان چڑھا ہے۔ ملک میں غربت، دہشت گردی، چوری چکاری، مہنگائی، بیروزگاری جیسے تمام مسائل کی جڑ جاگیر دارانہ کلچر سے جا ملتی ہیں۔ یہ عوام کو صرف اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اس نظام نے غریب کو غریب تر کر دیا ہے اس طرح معاشرہ بدحالی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جاگیر دار تمام وسائل پر قابض ہو کر صرف اپنے مفادات پر کام کرتا ہے وہ غریب، لاچار، مزدوری مزارع کو کبھی معاشی طور پر مستحکم نہیں ہونے دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر غریب یا مزارع مستحکم ہو گیا تو انکی جاگیر داری کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اس لئے اقتدار میں آنے کے بعد بھی وہ عوام کو بہتر سہولیات یا مواقع دینے سے گریز کرتے ہیں اس حلقے کے پاس ڈسکورس کی طاقت ہوتی ہے اور وہ اس طاقت کو استعمال میں لانے میں کامیاب بھی ہوتا ہے۔ عوام اس طبقہ کی غلامی بخوشی قبول کرتی ہے اور خوشی خوشی ان کے لیے کام کرتے رہتے ہیں اس طرح جاگیر دانہ نظام نے طبقاتی تفریق بنیاد ڈالی تھی۔ حاکم اور محکوم کے درمیان فرق نے معاشرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ محکوم طبقہ اس قدر ناانصافیوں کی چکی میں پس چکا ہوتا ہے کہ وہ اپنی حالت پر قناعت کر لیتا ہے مزاحمت کے تمام راستوں کو چھوڑ کر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر راضی ہوتا ہے کیونکہ جاگیر دارانہ نظام میں انسانی جان کی قیمت بہت ارزاں ہوتی ہے۔ جاوید انور نے اپنے افسانے ''مہربانی'' میں بھی اس کی جھلک دکھلائی ہے کہ کس طرح طاقتور طبقہ غریب طبقے کا استحصال کرتا ہے۔ نچلا طبقہ مزدوری کرنے کے باوجود بھی ملنے والی اجرت کو جاگیر دار طبقہ کی مہربانی تصور کرتا ہے نہ کہ اپنا حق: ''چودھری جی جو آپ کی خوشی ہم تو آپ کا دیا کھاتے ہیں آپ کی مہربانی سے پشتوں سے آپ چودھریوں کی خدمت کر کے بچے پال رہے ہیں۔''(۳۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاگیر دار طبقہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر غریب میں یہ احساس پیدا کر دیتا ہے کہ کام کے بدلے میں جو کچھ اجرت بھی ملتی ہے وہ بھی ان کی احسان اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ وہ اس غریب طبقہ کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ ان کے لئے اگر یہ کام نہ کرے تو ان کی جاگیر داری کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ چودھری نمبر دار کے بیٹے کے ختنے کرنے پر نذیر نائی کو انعام کے طور پر بھینس کا بچہ دیتا ہے۔ نذیر نائی اس انعام پر بہت خوش ہوتا ہے اور وہ دن رات محنت کرتا ہے اور بھینس کے بچے کو سالوں کی محنت سے پال کر بڑا کرتا ہے اور جب وہ اس اس کٹی کو جھوٹی بنا دیتا ہے تو نذیر نائی خود کو خوش قسمت انسان سمجھنے لگتا ہے کہ جھوٹی بچہ دہ گی تو

ایک سے دو ہو جائیں گی۔ وہ اس کی بدولت دودھ، گھی، مکھن کو بیچ کر معاشی آسودگی حاصل کر سکے گا۔ نذیر نائی یہ خواب دیکھ رہا ہوتا ہے تو چودھری کو کسی صورت نہیں بھاتا کہ نائی معاشی طور پر مستحکم ہو۔ وہ اپنے بندے کو حکم دیتا ہے کہ نذیر نائی کی جھوٹی کو رات میں غائب کر دیا جائے۔ چودھری اپنے خیالات کی عکاسی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

''ہاں ماجھے یہ کام اب ہو جانا چاہیے۔ کمیوں کے پاس وافر رزق آ جائے تو ہمیں کون پوچھے۔ یہ قدرت کا نظام ہے اس نے ایسے ہی چلنا ہے۔''(۳۵)

اس اقتباس میں طبقاتی نظام کی واضح شکل سامنے آتی ہے کہ اعلیٰ طبقہ کسی صورت بھی غریب طبقے کی خوشحالی برداشت نہیں کر سکتا ہے اور اپنی سوچ کو قدرت کے نظام سے جوڑتا ہے۔ اس کو مذہب کے لبادے میں اپنی سوچ پر عمل کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ طاقتور کو کمزور پر برتری حاصل ہے۔ جاگیر دار اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے کہ جاگیر دارانہ نظام اس قدر مضبوط اور طاقتور ہے کہ کوئی مذہبی نظام یا سیاستدان اس کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی ذہنیت نے اس طبقاتی نظام کو مستحکم کیا ہے۔ جاگیر دار طبقہ غریب کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا اپنا حق سمجھتا ہے کیونکہ وہ غریب کو کبھی معاشی طور پر مستحکم نہیں ہونے دینا چاہتا۔ کوئی بھی ملک اس وقت تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ ملکی وسائل وذرائع کی منصفانہ تقسیم عمل میں نہیں آتی۔

آج کے جدید دور میں سرمایہ دارانہ رویہ جاگیر داری نظام کی جدید شکل ہے۔ مزدور اور مزارع آج بھی معاشی استحصال کا شکار ہیں کیونکہ مادے کے ذرائع پیداوار اور اس کی تقسیم برابری کی سطح پر نہیں ہوتی ہے تو اس لیے انسانی معاشرہ طبقات میں تقسیم ہے۔ ہر طبقہ مسلسل کشمکش کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ مارکس کے خیالات کے مطابق بھی مثالی معاشرہ تب وجود میں آئے گا جب آجر اور اجیر کے درمیان اقتصادی کشمکش اور مقابلہ ختم نہ ہو جائے۔ اس اقتصادی آویزش کے خاتمے سے غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آئے گا کیونکہ ہر معاشرے میں انسان اور اس کی بنیادی ضروریات بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ جب معاشرے میں وسائل کی تقسیم برابری اور منصفانہ انداز میں عمل میں آئے گی تو لوگوں کو ان کا حق ملے گا تو طبقاتی نظام خود بخود ختم ہو جائے گا۔ لیکن ہمارے شہری نظام نے دیہات کے لوگوں میں آگاہی پیدا کی۔ شہروں کی ترقی نے عوام میں شعور پیدا کر دیا دیہات کے لوگوں میں بھی شہروں کی طرف رغبت پیدا ہو گئی۔

آج کے عصر حاضر دور میں دیہات اور شہروں کے فاصلے جدید ذرائع نقل و حمل کی بنیاد پر سمٹ چکے تھے۔ دیہاتی لوگوں نے جاگیر داروں اور زمین داروں کی غلامی سے تنگ آ کر شہروں کی طرف نقل مکانی نقل مکانی شروع کر دی۔ جدید دور کی ترقی نے گاؤں اور شہر کے فاصلوں کو سمیٹ کر دیہاتی زندگی میں سہولیات پیدا کر

کے دیہاتیوں کے اندر شعور پیدا کیا کہ ان جدید سہولیات سے فائدہ اٹھا کر وہ معاشی آسودگی حاصل کر سکتے ہیں۔ جاوید انور نے اپنے افسانے نیرنگی میں اس تبدیلی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''کمیوں کے لڑکے فیکٹری میں ملازم ہو گئے۔ گاؤں تک دو دو پکی سڑکیں آنے لگیں۔ لڑکیاں جو سارا دن گھروں میں گھس کر ہانڈی روٹی اور کڑھائی کروشیا سے باہر نہیں نکلتی تھیں، ویگنوں اور چنگ چیوں پر چڑھ کر سکولوں بلکہ کالجوں تک میں جانے لگی، نرسیں اور استانیاں بن گئیں۔''(۳۶)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید دور میں انسان کے اندر رہنے سہنے کا شعور آ گیا ہے۔ گاؤں کے وہ لوگ جو مزارع کی حیثیت سے سے وڈیروں اور زمینداروں کے آگے کام کرتے کرتے ساری زندگی ان کی خوشنودی حاصل کرنے میں گزار دیتے، آج کے جدید دور میں انسان کے اندر شعور پیدا کیا۔ ان نچلے طبقے کے لوگوں نے ان سہولیات سے فائدہ اٹھا کر اپنے بچوں کو علم کی دولت سے روشناس کرانے کا فیصلہ کیا۔ بہتر زندگی گزارنے کی خواہش ان کے اندر پیدا ہوئی اور اس کی تکمیل کے لیے وہ کوشش کرنے لگے۔

معاشرتی سطح پر طبقاتی شعور کی وجہ سے فرد احساس کمتری کا شکار تھا جب آگہی کے در کھلے تو فرد کو انفرادی سطح پر حقوق کی پامالی کا شعور حاصل ہوا۔ فرد نے غلامی کی زندگی کو ترک کر کے بہتر ذرائع کی تلاش میں خود کو مصروف کر لیا۔ اس طرح جاگیرداری نظام کو ٹھیس پہنچی۔ جاگیرداری نظام کے تحت غریب کے حقوق کی جو حق تلفی کی جاتی تھی جدید دور میں غریب اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے لگے تو اعلیٰ طبقہ ان کی آواز کو دبا نہ سکا۔

> ''کمی جو سال بعد گندم کے چار من دانے لے کر سال سال بھر ہر طرح کی خدمت کرتے تھے۔ اب کام کرنے شہر کو بھاگتے ہیں۔ ذرا کام بتاؤ تو منہ بگاڑ کر دیہاڑی کے حساب سے معاوضہ مانگتے ہیں۔ وہ پہلے والی چودھراہٹ نہیں رہ گئی۔''(۳۷)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصری دور میں دیہات کے منظر بدلنے لگے ہیں۔ انسانی رویوں اور نفسیاتی جہتوں میں تبدیلیاں رونما ہونے لگی ہیں، معاشرہ بدلنے لگا ہے، جاگیرداروں کی اجارہ داری زوال کا شکار ہونے لگی ہے، لوگوں کے اندر شعور بیدار ہوا ہے۔ لوگ تعلیم حاصل کرنے لگے ہیں، اعلیٰ طبقے کی غلامی ترک کر کے شہروں کی طرف بہتر سہولیات کی تلاش میں چل پڑے ہیں۔ جس سے دیہات کو نئے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر نئے اصول و روایت اپنانی پڑی ہیں۔

آج کے جدید دور میں تیز رفتار زندگی کا آغاز ہو چکا ہے۔ بااختیار طبقہ اپنی سوچ بدلنے پر مجبور ہوا ہے کیونکہ آج کا مزارع یا غریب نئی تعلیم کی روشنی میں جدید نظریات سے آگاہ ہو چکا ہے۔ نئی نسل تعلیم کی اہمیت سے

واقفیت حاصل کر چکی ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کی نسبت زیادہ روشن خیال ہے۔ متوسط طبقے کے نوجوان نئے پیشوں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ کام کرنے کو کوئی بھی باعث عار نہیں سمجھتا اس طرح وہ طبقہ جو اعلیٰ طبقے کا غلام تھا اس نے انکی غلامی کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہوا جب لوگوں کے اندر شعور پیدا ہوا، لوگوں نے تعلیم حاصل کی، گاؤں سے شہر کے فاصلے جدید ٹیکنالوجی کے باعث سمٹے اس طرح طبقاتی تضاد میں کمی واقع ہوئی۔ ''چوھدریوں کی نسبت اب کمیوں کے پاس زیادہ پیسے ہیں۔ وہ چھوٹا موٹا کام کر لیتے ہیں۔ عزت انا کا مسئلہ نہیں بناتے۔ نقد دیہاڑی لیتے ہیں روز کے روز۔''(۳۸)

جاوید انور نے اپنے افسانوں میں جہاں طبقاتی تضاد کی مختلف صورتیں اجاگر کیں، وہیں افسانہ ''نیرنگی'' میں دکھایا کہ تعمیر نو کی طرف بڑھنے کی رفتار میں بھی تیزی آئی ہے۔ لوگوں نے شہروں کی طرف جا کر اپنے پیشوں کو جدید طریقے سے استعمال کر کے اپنے حالات میں تبدیلی لائی ہے۔ وہ خود کو معاشی طور پر مستحکم کرنے کی کوشش میں لگے ہیں اور اس طرح وہ معاشرے کے کارآمد فرد بن کر اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ب: سیاسی زندگی کے معاصر رویے

سیاست انسانی زندگی کا ایک خاص شعبہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک غالب حیثیت کا حامل ہے۔ انسان کے طرز احساس کی تشکیل میں جو عناصر حصہ لیتے ہیں ان میں سیاست بھی سر فہرست ہے۔ ہر فنکار اپنے زمانے اور اپنے زمانے کے حالات سے آگاہی کے بغیر زندہ ادب تخلیق نہیں کر سکتا ہے۔ ادب زندگی کی ترجمانی کا نام ہے اور زندگی کو متاثر کرنے والے مظاہرے میں سیاست بھی شامل ہے۔ ادیب اپنے عہد کے سیاسی رویوں سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے اور حال سے آگاہی کے ساتھ ماضی کے حالات و واقعات کو اپنے سامنے رکھتا ہے تاکہ مستقبل کے لیے ایک لائحہ عمل بنا سکے اور عصری آگہی کا سب سے اہم جزو سیاسی آگہی ہے کیونکہ سماج پر جو قوت سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے وہ سیاست ہے۔ آج کی عصری دور میں نہ صرف ملکی سیاسی قوتیں سماجی امور پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ بین الاقوامی سیاست کے اثرات بھی اندرونی سیاست کو متاثر کرتے ہیں۔ آج کے عہد میں ادب کا سیاسی نظریات اور عوامل سے اثر قبول کرنا عام سی بات ہے۔ اس ضمن میں رشید امجد لکھتے ہیں ''زندہ ادیب اپنے عہد اور اس کے شعور سے اپنا رشتہ توڑ ہی نہیں سکتا۔''(۳۹)

اس لئے کوئی بھی شاعر، مصنف یا ادیب اپنے عہد سے لاتعلق رہ کر کوئی تخلیق کر ہی نہیں سکتا ہے۔ اس

لیے ادب کا سماج سے علیحدہ کوئی تعلق نہیں۔اس لیے ادیب معاشرے میں عوام اور حکومت کے تعلقات کی نوعیت اور حالات و واقعات کو بھی ادب میں بیان کرتا ہے۔ سیاست معاشرے کے مقتدر قوت ہونے کے سبب زندگی کے تمام شعبوں پر اثرات مرتب کرتی ہے۔ادیب ان حالات کا مشاہدہ کر کے انہیں اپنی تخلیقات میں بیان کرتا ہے۔

اسی طرح جاوید انور نے بھی اپنے افسانوں میں سیاسی زندگی کے معاصر رویوں کی عکاسی کی ہے، ان کا افسانہ ''مہابندر'' گہری سوچ کا آئینہ دار ہے۔اس میں انسانی زندگی کو جنگل کی زندگی میں پیش کیا ہے۔ جنگل جہاں پر شیر حکمرانی کرتا ہے اور شیرنی کے شکار پر ہمیشہ قابض ہوتا ہے لیکن پھر بھی شیر کو بادشاہ مانا جاتا ہے۔ جنگلی جانور شیر کے ذریعے معاصر حکومتی پالیسیوں پر طنز کیا جارہا ہے کہ آج کے معاصر دور میں جنگل کے بادشاہ شیر کی طرح حکومت کٹھ پتلی کی مانند ہے، ہر انسان من مانی کر رہا ہے۔اس افسانے میں حکومتی نااہلی کو بھی دکھایا گیا ہے۔ ''جس کا جو جی چاہتا ہے کرتا چلا جاتا ہے۔ شیر کہاں کا بادشاہ ہے؟ اگر بادشاہ ہے تو اس کا کس پر کنٹرول ہے کس پر حکومت ہے۔؟''(۴۰)

اسی طرح آج کے جدید دور میں طاقتور کو اہمیت دی جاتی ہے۔اس کی ہر بات سنی اور مانی جاتی ہے جبکہ غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کے لیے سخت اصول و قوانین بنائے جاتے ہیں۔انصاف پر مبنی معاشرہ تب وجود میں آسکتا ہے جب ملک میں منصفانہ پالیسیاں بنائی جائیں دھوکا، فریب، دغا بازی کو کم کیا جائے۔اس افسانے میں بندروں کا گروہ شیر کے خلاف کانفرنس منعقد کر کے حالات حاضرہ پر طنز کرتا ہے نتیجتاً شیر بندروں کو جنگل چھوڑنے کا حکم دیتا ہے اور بندر بھی اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے جنگل چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔انسانوں کی آبادی کی طرف جانے کا سوچتے ہیں کہ انسان آزاد ہیں اور اپنی مرضی سے زندگی گزارتے ہیں تو ہمیں بھی آزادی کا پورا حق دیں گے۔ لیکن جنگل کے دوسری طرف انسانوں کی اسمبلی کا اجلاس جاری ہوتا ہے اور وہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے اقدامات شمار کر رہے ہوتے ہیں۔انسانی آبادی میں انسانوں کو غلام بنانے کا لائحہ عمل تیار ہو رہا ہوتا ہے۔ لال گلابی منہ والی نوجوان بندریا میڈیا مینیجر ہونے کے منصب اور اپنے قیمتی لباس کو سنبھالتی ہوئی سنہری نوٹ بک میں نوٹس لیتی جارہی تھی۔ ''وہ جانتی تھی کہ عیاری، مکاری، بندر بانٹ، اچھل کود اور شور شرابا ہی اشرافیہ کو معتبر و مقتدر بنا سکتے ہیں۔ جمہوری بادشاہت قائم رکھ سکتے ہیں۔''(۴۱)

اسی طرح جاوید انور نے اپنے افسانے ''مہربانی'' میں اعلیٰ طبقے کی ناانصافیوں کو اجاگر کیا کہ کس طرح چوھدری گاؤں کے کمی لوگوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں۔ اگر وہ ان غریب لوگوں پر کوئی مہربانی کرتے بھی

ہیں تو چوری چکاری سے واپس لینے میں عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ان کے نزدیک میں یا غریب کو معاشی طور پر آسودہ ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں کیونکہ اس طرح وہ ان کی غلامی سے نکل جائے گا۔یہ رویہ کسی بھی معاشرے کو ترقی کی طرف گامزن نہیں کر سکتا ہے۔ ''کمیوں کے پاس وافر رزق آجائے تو ہمیں کون پوچھے۔یہ قدرت کا بنایا نظام ہے اس نے ایسے ہی چلنا ہے۔''(۴۲)

اس حوالے سے سماجی تعلقات پر مبنی سوچ دکھائی گئی ہے کہ اعلی طبقہ نادار اور غریب لوگوں کا استحصال کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔وہ کبھی بھی ان نچلے طبقے کے لوگوں کو سر اٹھانے نہیں دیتے ہیں۔ان کے حالات بہتری کی طرف جارہے ہو تو وہ ان سے وسائل چھین لیتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ قدرت کا نظام ہے کہ ان لوگوں کو ان کے لیے کام کرنا ہے، غلامی کرنی ہے۔ہر دور میں کمیوں اور مزارعوں کو جاگیرداروں اور زمین داروں کی خوشنودی حاصل کیے بغیر زندگی گزارنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جاگیردار، چودھری، چھوٹے کاشتکاروں یا کمیوں کا استحصال نہ کرے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا رعب و دبدبہ ختم ہو جائے گا۔اس لیے وہ غریبوں کو غربت کی لکیر پر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جاوید انور نے اپنے افسانے ''مہربانی'' میں مقتدر طبقے کی ان ناانصافیوں کو اجاگر کیا کہ کس طرح خود ہی جھوٹی کو چوری کرا کے عوام کے سامنے خود چل کر نذیر نائی کے گھر جانا اور تفتیش کا حکم دیتا ہے۔یہ مقتدر طبقہ کا دوغلہ پن ہے۔ عوام کے سامنے خود کو رحم دل اور انصاف پسند ثابت کرنے کے لیے ہمدردی دکھائی جاتی ہے۔ ''او! یہ ظلم ہو گیا۔ان بیچاروں کا جانور کون کھول کر لے گیا۔وہ نمانے مسکین ہیں۔''(۴۳)

اس طرح یہ ایک سیاسی رویہ سامنے آتا ہے کہ چودھری خود کو رحمدل، احساس کرنے والا ظاہر کرتا ہے کہ اس کو غریب کمی نذیر نائی کے نقصان کا کتنا افسوس ہے۔یہ سیاسی رویے ہر دور میں اعلی طبقے میں موجود رہے ہیں۔ اس طرح وہ خود کو عوام کا پیشوا، خدمت گار ثابت کر کے عوام کی رائے اپنے حق میں کرواتے ہیں۔تاکہ ان کی عزت، رعب و دبدبہ قائم رہے غریب ان کا مشکور رہے۔اس لیے چوری کرانے کے بعد خود ہی تفتیش کا حکم دیتا ہے کیونکہ ان کا اپنے علاقے پر پورا کنٹرول ہوتا ہے۔ تمام ادارے ان کے ماتحت ان کی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ان کا سرکاری دربار پر مکمل اثر ورسوخ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی من مانی کرتے ہیں اور اپنی مرضی کے نتائج سامنے لانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ''مہربانی'' افسانے میں بھی چودھری اس ہتھکنڈے کو استعمال کرتے ہوئے تفتیش کا حکم دیتا ہے۔ ''رفیق کھوجی کو بلا کر لا، کوئی کھوج نکالیں کون یہ ظلم کر گیا ہے۔ جھوٹی تو ڈھونڈنی ہی پڑے گی۔''(۴۴)

اس افسانے میں مقتدر طبقہ کی سوچ کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح آج کے جدید دور میں بھی طبقاتی فرق

کو روا رکھا جاتا ہے۔ کمیوں اور غریبوں کا استحصال کیا جاتا ہے، ان کو غلامی پر مامور رکھا جاتا ہے۔ ان کی خوشحالی کے لیے کسی قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا جاتا ہے، سکول تک نہیں بنائے جاتے ہیں کہ غریب کا بچہ پڑھ لکھ کر ان کی غلامی سے انکار نہ کر بیٹھے۔ یہ سوچ جاگیر دار طبقے میں عام پائی جاتی ہے وہ دوسروں کو خود سے کم تر دیکھتے ہیں۔ ان کے اپنے قانون اور اصول ہوتے ہیں۔ انہیں اصول و قوانین کا پابند بنا کر غریب کا استحصال کرتے ہیں۔ ان کو آزادانہ زندگی کا اختیار نہیں دیتے ہیں۔ اس طرح دیہی علاقوں میں نسل در نسل غلامی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے جس کی وجہ سے سماج پسماندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔

ج: سیاسی مسائل کے عام آدمی کی زندگی پر اثرات

سیاسی زندگی کا آغاز بھی انسان کی معاشرتی زندگی سے ہوتا ہے۔ انسان نے معاشرے میں جب ساتھ مل کر رہنے کا فیصلہ کیا تو اس کو اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے ایسے نظام یا ضابطے کی ضرورت پیش آئی جس کے اطلاق سے معاشرے میں نظم و ضبط قائم رہے۔ سماجی زندگی میں سیاسی زندگی کے تمام تر پہلو شامل ہوتے ہیں۔ زندگی کے تمام شعبے بالواسطہ یا بلا واسطہ سیاست سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے ادب میں بھی سیاسی زندگی سے متعلق حالات و واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ ادیب اپنے آس پاس ہونے والے واقعات، سیاسی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی وغیرہ کو اپنی تخلیقات میں بیان کر کے عوام کو ان سے آگاہ کرتا ہے۔ ادیب کو اپنے عصری زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ عصری زندگی کے بہت سے مسائل سیاست سے متعلق بھی ہوتے ہیں۔ ادیب ان مسائل سے ماورا ادب تخلیق نہیں کر سکتا ہے کیونکہ ہر ادب میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی حالات و واقعات واضح نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں وارث علوی لکھتے ہیں۔ ''فنکار کا اپنے عصری زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اور اگر اس کی عصری زندگی کے مسائل خاص طور پر سیاسی ہیں تو یہ مسائل بھی اس کے ادب میں جھلکتے ہیں۔''(۴۵)

کیونکہ انسانوں کا سیاست سے الگ کوئی وجود نہیں ہے نہ ہی انسانوں سے ماورا کوئی ادب اپنا وجود رکھتا ہے۔ اس لیے ادب اور انسان کا رشتہ ہمیشہ سے قائم ہے۔ ادب انسانی زندگی سے ہی قوت، آہنگ حسن حاصل کرتا ہے۔ سیاست معاشرے کی مقتدر قوت ہے اس لیے ادب سمیت زندگی کے تمام شعبوں پر اپنے اثرات ڈالتی ہے۔ اس لیے ادب کا سماج سے علیحدہ کوئی وجود نہیں۔ ادیب معاشرے کا دانشور رکن ہوتا ہے تو وہ سماج کے تمام مسائل کا بخوبی جائزہ لیتا ہے۔ ادیب کو سیاسی شعور عام انسانوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ معاشرے کے ذی فہم فرد کی طرح ادیب بھی حکومت چلانے والے اداروں اور لوگوں کے منصب اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہوتا ہے روسو کہتا ہے: ''عوام

اپنی رضا کی بنا پر ریاست سے ایک معاشرتی معاہدہ کرتے ہیں۔"(۴۶)

اس معاہدے کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں جن کے تحت عوام کو بلاامتیاز تمام حقوق فراہم کیے جاتے ہیں۔ ادیب بھی اس نظام کا حصہ ہوتا ہے وہ اس مثالی نظام سے متعلق سوچ بچار کرتا ہے۔ یہ نظام ہم آہنگی کے اصولوں پر مشتمل ہو تو وہ اس نظام کو سراہتا ہے۔ جب اس نظام میں بد نظمی یا بد دیانتی محسوس کرتا ہے تو اس کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرتا ہے۔ اس لیے ہر دور کا ادیب اپنے عہد کے اصل حالات کو بیان کرتا ہے۔ کوئی ادیب اپنے عہد کے حالات و واقعات کو نظر انداز کر کے بہترین ادب تخلیق نہیں کر سکتا ہے۔ آج کے جدید دور میں ادیب اپنے اس منصب سے آگاہ ہے اور عصری دور کے سیاسی رویوں کو عوام کے سامنے لاتے ہیں۔ اسی طرح جاوید انور نے بھی اپنے چند ان افسانوں میں سیاسی مسائل کے عام آدمی کی زندگی پر اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

آج کے عصری دور میں سیاست نے ہمارے سماج کو کس طرح متاثر کیا۔ انہوں نے اپنے افسانے "برگد" میں بتایا کہ کس طرح امیر طبقہ غریب طبقے کا استحصال کرتا ہے۔ آج کے جدید دور میں بھی دیہاتی کلچر میں جاگیر داری نظام موجود ہے۔ گاؤں کے غریب مزارع جوان کی خوشنودی کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں، ان کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتتے ہیں لیکن پھر بھی ان کو اپنی خواہشات کو دبانا پڑتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اپنے بچوں کی زندگیوں کے فیصلے بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی طرح افسانے "برگد" میں نمبر دار کے پترا اچھو کو ڈومنی میراثن سے دلی وابستگی ہو جاتی ہے لیکن اس کی قیمت ڈومنی میراثن گاماں کو اپنی جان اور اپنے باپ کی جان دے کر چکانی پڑتی ہے۔ راتوں رات دونوں باپ بیٹی کا قتل کر دیا جاتا ہے۔ لوگوں میں یہ بات پھیلا دی جاتی ہے کہ برگد کے نیچے گاماں کے باپ نے پیشاب کر کے ان کی دعوت خراب کر دی۔ اس لیے بگے کی لاش برگد سے جھول رہی تھی۔ "بگے نے برگد کے نیچے پیشاب کر کے جنوں کی دعوت خراب کر دی تھی۔ پھر یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔"(۴۷)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آج بھی گاؤں کے لوگوں میں توہمات کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ چوہدریوں نے ان توہمات پر مبنی سوچ سے فائدہ اٹھا کر غریب بگے اور گاماں میراثن کا قتل کرا دیا۔ صرف اپنے بیٹے اچھو کی پسندیدگی کو جان کر غریب کا استحصال کر دیا۔ طاقت کا یہ رویہ وڈیروں میں پہلے بھی موجود تھا اور آج کے اس عصری دور میں بھی بہت سے غریب طبقے اسی استحصال کا شکار ہیں۔ یہ طاقتور لوگ غریب کو مروا کر خود ہی اس واقعے کی مذمت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ عوام سے اپنے اچھے ہونے کا ووٹ حاصل کر سکیں۔ "نمبر دار نے اپنے سامنے تفتیش کروائی کیونکہ بگا میر عالم اس کا خاص الخاص پشتی میراثی تھا۔"(۴۸)

اس اقتباس میں سیاسی رویے کی عکاسی ملتی ہے کہ کس طرح نمبر دار قتل کروا کے مقتول کے قتل کی تفتیش کرواتا ہے تاکہ لوگوں کی ہمدردی اور تعریف سمیٹ سکے۔اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ سیاسی اثر رسوخ اور طاقت کے بل بوتے پر کس طرح غریب طبقے کا استحصال کیا جاتا ہے ان سے جینے کا حق چھین لیا جاتا ہے۔

اسی طرح ''دشت و وحشت''افسانے میں حکومتی سطح پر استحصال کی کیفیت دکھائی گئی ہے کہ کس طرح حکومت اور ریاستی ادارے آپس میں مل کر کرپشن میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ کس طرح حکومتی وسائل کا استعمال غلط طریقے سے کیا جارہا ہے۔ایک ریل کے سفر میں تمام اخلاقی و سماجی برائیوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے کہ کس طرح وہ محکمے جو انسان کی جان ومال کی حفاظت پر معمور ہو کر ان کاموں میں ملوث ہوتے ہیں جو انسانیت کے لئے سم قاتل ہیں۔

اس افسانے میں معاشرتی ناہمواری کے ساتھ ساتھ حکومتی سطح پر اداروں کی کرپشن اور نااہلی کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ملک میں منشیات کی سمگلنگ میں یہ ادارے ملے ہوتے ہیں۔چند روپیوں کی خاطر ملک کی سلامتی اور تعظیم کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔''سر جی یہ جو کسٹم والے ہیں ہر ہفتے واپسی پر اسی ٹرین سے نوٹوں کے سوٹ کیس بھر کر لاتے ہیں۔پھر شہر میں آکر تقسیم کرتے ہیں۔''(۴۹)

اسی طرح ایک اور جگہ پر کہتے ہیں: ''سر جی اس گاڑی کے ذریعے رج کے کرپشن ہوتی ہے۔سب مل کر مزے کرتے ہیں۔سب کی مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔''(۵۰)

اس حوالے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کسی ایک فرد کے ذریعے برائی نہیں کی جاتی ہے بلکہ پورا نظام اس میں ملوث ہوتا ہے۔جب تک نظام نہیں بدلے گا عوام کی خوشحالی ممکن نہیں۔ معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا ہے۔نظام بدلنے کے لئے افراد کی تعمیر و تشکیل بہت ضروری ہے۔ موجودہ سیاسی نظام میں اس پہلو پر توجہ نہیں دی جارہی ہے سیاست میں بھی شامل کئی مقتدر افراد اخلاقی گراوٹ کا شکار ہیں جن کے باعث اداروں کو اپنے مقاصد کے تحت کام کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔

حکومتی و ریاستی نظام میں کمزور طبقے کی حیثیت صرف ایک تماشائی کی سی ہے۔کیونکہ آج کے جدید دور میں بھی انسان میں طبقاتی فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ہمارے ملک کی آبادی کا غالب حصہ کمزور اور متوسط طبقے پر مشتمل ہے۔اس طبقہ کا استحصال جاگیرداری نظام کے تحت ہو رہا ہے جب یہ نظام سرمایہ داری کی طرف جاتا ہے تو بھی آجر اور اجیر کے درمیان فرق ختم نہیں ہوتا۔ان کے درمیان فاصلہ بدستور قائم رہتے ہیں۔دیہاتی آبادی میں متوسط طبقے کی استحصال کی مختلف شکلیں دکھائی دیتی ہیں جاگیردار طبقہ کی ذہنیت بن چکی ہے کہ اگر وہ چھوٹے

کاشتکاروں یامزاروں کا استحصال نہیں کریں گے توان کا رعب و دبدبہ ختم ہو جائے گا، وہ ان کو ہمیشہ غلامی کی زندگی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

جاوید انور نے اپنے افسانے ''مہربانی'' میں اسی قسم کے رویے کی عکاسی کی ہے کہ چوہدری کس طرح غریب نائی کو جھوٹی دے کر خود اپنے بندوں کے ذریعے غائب کروادیتا ہے تاکہ اس جھوٹی کی بدولت ان کے رزق میں فراوانی نہ ہو، ان کے معاشی حالات آسودگی کی طرف نہ چلے جائیں۔ اس افسانے میں غریب کی بے بسی اور سیاسی رویے کی جھلک دکھائی گئی ہے کہ چودھری نذیر نائی کے گھرانے کی دلجوئی کے لیے خود ہی کھوجی کو بلوا کر تحقیق کروانے کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ گاؤں والوں کے سامنے اس کی عزت میں اضافہ ہو سکے کیونکہ چوہدری کا اثر رسوخ اور روب ودبدبہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ جھوٹی کو غائب کر کے بھی اپنے لوگوں کے ساتھ ساز باز کر کے غریب نظیر کا استحصال کرتا ہے اور کہتا ہے: ''اسماعیل! میرا بچہ! تو ذرا جا کر رفیق کھوجی کو بلا کر لا۔ کوئی کھوج نکالیں کون یہ ظلم کر گیا ہے۔ جھوٹی تو ڈھونڈنی ہی پڑے گی۔''(۵۱)

اس طرح تحقیق کر کے چودھری خود کو غریب کا پیشوا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نذیر نائی کے اوپر اپنا ایک اور احسان چڑھا دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی سال کی محنت سے پالی ہوئی جھوٹی کو بھول کر چودھری کے احسان تلے دب جاتا ہے اور کہتا ہے کہ چوہدری صاحب ہمیں معاف کر دیں آپ کی مہربانی ہم سے سنبھالی نہیں گئی۔ ''چوہدری جی ہم بھوری کے قابل ہی نہیں تھے۔ ہماری نہ اتنی اوقات تھی نہ مقدر، چودھری جی ہمیں معاف کر دیں۔''(۵۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر طبقہ مسلسل غریب طبقہ کا استحصال کرتا نظر آتا ہے۔ انہیں پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ اپنے حالات تبدیل کرنا بھی چاہیں تو پھر بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی آواز غربت کی چکی کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ وہ جاگیردار طبقہ کی ناانصافیوں کا بوجھ اٹھائے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن پسماندگی کو دور نہیں کر پاتے یہ نظام نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ تمام حکومتی اور سیاسی ادارے بھی انہی کے حامی ہوتے ہیں۔ عام آدمی کی ان تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔

اجمالی جائزہ

سماجی زندگی میں سیاسی زندگی کے تمام پہلو شامل ہوتے ہیں اور زندگی کے تمام شعبے بالواسطہ یا بلاواسطہ سیاست سے متاثر ہوتے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں کے ہاں ان تمام واقعات کو اہمیت دی جاتی ہے جو عصری زندگی

سے متعلق ہوتے ہیں۔اسی زندگی کے بہت سے مسائل سیاست سے بھی جڑے ہوتے ہیں اس سے جدید افسانہ نگاروں نے عصری زندگی کے سیاسی رویوں کو عوام کے سامنے لانے کی پوری کوشش کی ہے۔جدید افسانہ نگار رشید امجد نے بھی اپنے افسانوں میں سیاسی و عصری انتشار کی عکاسی کی ہے۔آپ نے اپنے افسانے ''لیمپ پوسٹ''میں ماحول کی افراتفری، زندگی کے تلخ حقائق، معاشرے میں چوہدری کا کردار، طبقاتی تقسیم، سیاسی و سماجی گھٹن اور دوسرے عوامل کی عکاسی کی۔ان کا افسانہ ''بے چہرہ آدمی''میں شناخت، پہچان کا فقدان، سیاسی و سماجی المیہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

''بیزار آدم کے بیٹے''میں خارجی زندگی کا یہ خوفِ انتشار بھرپور طریقے سے سامنے لاتے ہیں۔آپ ایک طرف عام آدمی کی مصیبت زدہ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں تو دوسری طرف بڑی جرات و بے باقی سے سماج کے مقدر اور صاحب اختیار طبقے کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔آپ نے ملک پر مختلف ادوار میں برپا ہونے والے مظالم، محنت کشوں اور مزدوروں کے احساس محرومیت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اس تعداد کو سماجی اور سیاسی سطح پر ابھارنے کے ساتھ ساتھ ان سب کی تصویر کشی علامتی انداز میں کرتے ہیں۔

منشایاد کا شمار بھی جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے آپ نے بھی معاشرے کی سفاکیوں اور بے اعتدالیوں کے ساتھ ساتھ سیاسی جبر کو بھی صداقت سے پیش کیا۔آپ کے افسانوں کا خمیر اپنے ارد گرد ماحول سے اٹھایا ہے۔ آپ نے جاگیر دارانہ سماج میں نچلے طبقے کی زندگیوں اور طبقاتی کشمکش کے موضوع کو ضبط تحریر بنایا ہے۔آپ کے بیشتر افسانے سیاسی شعور سے لبریز نظر آتے ہیں۔آپ نے افسانوں میں زیادہ تر دیہاتی زندگی کو موضوع بنایا جہاں غریب اور مفلوک الحال اور متوسط طبقے چودھریوں اور ساہوکاروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہیں۔اپنی آزادی اور برابری کے حقوق کی خاطر سر گرداں رہتے ہیں ان کے افسانے ''دوپہر اور جگنو''، ''سورج کی تلاش''، ''تیرھواں کھمبا''اور ''بند مٹھی میں جگنو''میں منشیات کے سیاسی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اسی طرح ''اندھیرے سے اندھیر تک''میں سیاسی اور سماجی جبر اور طبقاتی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''زوال کے اسباب''میں تباہ حال شہر کے اسباب کو موضوع بنایا۔جنرل ضیاء الحق اور آمریتوں سیاسی جبریت کے حوالے سے ''رکی ہوئی آوازیں''اہم افسانہ ہے۔''تماشا''افسانہ بھی سیاسی شعور کا عمدہ عکاس ہے۔افسانہ ''کاشی''میں جمہوری اداروں کی ناکامی اور عوام کے منتخب نمائندوں کا مصلحتوں اور خواہشوں کے ہاتھوں بک کر کر اپنے وعدوں سے رو گردانی کرنے کی داستان کو بیان کرتا ہے۔

اسد محمد خان جدید افسانہ نگار ہے۔آپ نے اپنے افسانوں میں سیاسی و سماجی ناانصافی، بااثر طبقے کی کمزور

لوگوں پر ظلم و زیادتی اور exploitation کا حال عمدہ طریقے سے بیان کیا. اسد محمد خان کے پہلے افسانوی مجموعے ''کھڑکی بھر آسمان'' میں سیاسی اور نفسیاتی الجھنوں معاشرتی ناہمواریوں اور سیاسی سماجی صورتحال پر طنزیہ لہجے اور اپنے عہد کی سفاک ہے کہ حقیقتوں کی عکاس عمدہ انداز میں کی۔

اسی طرح ان کے افسانوی مجموعہ ''غصے کی فصل'' میں مشمولہ افسانے ''سرکس کی سادہ سی کہانی''، ''وقائع نگار''، ''طوفان کے مرکز'' وغیرہ اسد محمد کے سیاسی شعور کے غماز ہیں۔ اسد محمد خان اردو کے جدید اور منفرد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے تاریخی اساطیر اور اپنے عہد کے سیاسی و سماجی مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا۔

اعجاز راہی نئی نسل کے ایک ایسے کہانی کار ہیں جنہوں نے معاشرے کے دکھ کو محسوس کیا آپ نے انیس سو ستر کے مارشل لاء کے خلاف احتجاج میں جو شدت آئی تو اعجاز راہی بھی اسی تحریک کے اہم پروردہ ہیں۔ آپ کے افسانوں میں اپنے عہد کا سیاسی جبر فنی مہارت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے سیاسی شعور کی معنویت سے لبریز ہیں۔ اعجاز راہی کے افسانوی مجموعے ''تیسری ہجرت'' میں شامل افسانے ترقی پسندانہ رجحان کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ استحصالی نظام، جبر و استبداد اور سیاسی معاشرتی اقدار جیسے موضوعات پر مشتمل ہے۔

اسی طرح احمد جاوید کا شمار بھی جدید نسل کے افسانہ نگار کے طور پر ہوتا ہے۔ آپ کے افسانوں میں سیاسی و سماجی استحصال، معاشرتی جمود، نچلے طبقے کے معاشی مسائل، مسلسل خوف و ہراس کی فضا سے لبریز ہے۔ انہوں نے زیادہ تر سیاسی شعور اور سیاسی جبریت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''غیر علامتی کہانی'' ان افسانوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۷۷ کے مارشل لا کے رد عمل میں لکھے گے۔ یہ سب افسانے کسی نہ کسی حد تک سیاسی دباؤ کے خلاف شدید احتجاج اور مزاحمت کے رویے کو اجاگر کرتے ہیں۔

اس مجموعہ کے اہم افسانے ''غیر علامتی کہانی''، ''آثار''، ''گشت پر نکلا ہوا سپاہی''، ''باہر والی آنکھ''، ''پیادے''، ''زنجیر'' وغیرہ ہیں۔ اسی طرح ضیا آمریت کے حوالے سے لکھا گیا افسانہ ''سن تو سہی'' بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایسے سردار کی کہانی ہے جو نسل در نسل سرداری نظام کی پیداوار ہے۔ ''کانچ کا شہر'' اور ''شیشے کی گلیاں'' بھی احمد جاوید کے سیاسی نظریات کے حامل افسانے ہیں۔ ''کیا جانوں میں کون'' سرمایہ داریت کے خلاف کھلا احتجاج اور باغیانہ رویہ سے لبریز ہے۔ اسی طرح احمد جاوید نے زیادہ تر سیاسی گھٹن و جبریت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

اسی طرح احمد داؤد اردو افسانے کی دنیا کا اہم نام ہے جو نہ صرف کہانی کار ہیں بلکہ جدید افسانے کو ہم عصر معنویت دینے والوں میں بھی اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ آپ نے جس دور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا وہ سیاسی جبر کا زمانہ ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی و ماحول، سیاسی گھٹن، مارشل لاء کا جبر اور سیاسی شعور کو نہایت خوبی سے بیان کیا۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''مفتوح ہوائیں'' کے افسانوں میں فوجی آمریت کے خلاف احتجاج کو علامتی اور تجریدی انداز سے پیش کر کے اردو میں مزاحمتی ادب کو نیا زاویہ عطا کیا۔ اس مجموعے میں شامل افسانے ''بنجر ریکھا کا سفر''، ''وسکی'' اور ''پرندے کا گوشت''، ''عجائب گھر ۱۔۲۔۳'' اور ''کمپوزیشن-۷۹'' وغیرہ احمد داؤد کے سیاسی شعور کے غماز ہیں۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں مرزا حامد بیگ ایک علامتی افسانہ نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ آپ کا سیاسی شعور قابل داد ہے۔ آپ نے ۱۹۷۲ء کے آخر میں ''افسانہ وافسوں کی حشیشی رات'' اور ''شب آگاہی'' کے عنوان سے دو افسانے لکھے جو سیاسی شعور کے حامل ہے۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت سے متعلق مزاحمتی افسانے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کے پہلے افسانوی مجموعے ''گمشدہ کلمات'' میں شامل افسانے ان کے سیاسی نظریات کے حامل ہیں جن میں اہم افسانے ''زمین جاگتی ہے''، ''گمشدہ کلمات''، ''بابے نور محمد کا آخری کبت''، ''یادگار محفوظ'' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت اور ضیاء الحق کے دور حکومت سے متعلق مزاحمتی افسانے ہیں۔ جن میں مرزا حامد بیگ کا سیاسی شعور علامتی اور استعاراتی انداز کے ساتھ ساتھ تجریدی انداز بھی واضح ہوتا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''تار پر چلنے والی'' میں مرزا حامد بیگ نے ضیاء الحق دور کی منافقانہ پالیسیوں اور سیاسی نظریات کا پرچار کرنے کے ساتھ ساتھ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے بھی اہم افسانے لکھے جن میں ''تربیت کا پہلا دن''، ''پروڈکشن-۲'' اور افسانہ ''رہائی'' شامل ہیں۔ مرزا حامد بیگ کی افسانہ نگاری پر ۷۰ اور ۸۰ کی دہائی کے رونما ہونے والے سیاسی مسائل کا عکس نظر آتا ہے آپ نے جاگیر دارانہ نظام میں ہونے والے انسانی استحصال کی عکاسی کی۔ سیاسی، جبر، سماجی بد نظمی اور غیر منصفانہ معاشی نظام کو اپنے افسانوں میں بیان کیا۔

مظہر الاسلام ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ آپ کا افسانوی مجموعہ ''گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی'' مارشل لاء کے دوران شائع ہوا۔ اس میں شامل افسانے سیاسی شعور کے غماز اور اس دور کی پابندیوں حبس اور سیاسی گھٹن کے خلاف کھلا احتجاج ہیں جو علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اس حوالے سے اہم افسانے ''متروک آدمی''، ''کلرکوں کے خواب''، ''گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ''چوراچوری'' وغیرہ ہیں۔ ان کے افسانوں

میں عصری صورتحال، حادثات، سانحات، مشینوں کی کھٹ کھٹ کا تسلسل، جنگلوں کی کٹائی، کار و موٹر سائیکلوں ٹرکوں وغیرہ کے شور شرابے نیز سیاسی و سماجی اور معاشی اونچ نیچ کو بیان کیا گیا ہے۔

زاہدہ حنا ایک لبرل ترقی پسند اور حیات رکھنے والی افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں میں معاشرے میں ہونے والی بہت سی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ان کے افسانوں کے مجموعے ''قیدی سانس لیتا ہے''، ''راہ جل میں ہے''، ''رقص بسمل'' میں سیاسی شعور کی معنویت سے معمور افسانے شامل ہیں۔جو ہند و پاک بنگلہ دیش کے سیاسی اور سماجی بحران، سقوط ڈھاکہ کے المیے، سامراجی طبقے کی جبریت، مارشل لاءاور کراچی کے سیاسی حالات دہشت گردی بدامنی و بے چینی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

آصف فرخی اسی کی دہائی میں سامنے آتے ہیں۔ان کے افسانے خوف، دہشت اور محبوسیت کے مختلف زاویوں سے تشکیل پاتے ہیں۔آصف فرخی کے افسانوی مجموعہ ''آتش فشاں پر کھلے گلاب''، ''اسم اعظم کی تلاش''، ''شہر بیتی''، ''شہر ماجرہ'' اور ''ایک آدمی کی کمی'' کی بیشتر کہانیاں سیاسی شعور اور روزمرہ زندگی میں درپیش مسائل، اندیشوں، واہموں، افواہوں، وحشت و بربریت، قتل وغارت کی تصویریں اور نفسیاتی، معاشرتی و معاشی مسائل کی عکاسی بخوبی سے کرتی ہیں۔

مبین مرزا کا شمار بھی اسی کی دہائی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔اپنے گردوپیش رونما ہونے والے حالات و واقعات سیاسی اور سماجی معاشی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔مبین مرزا معاشرتی ناہمواریوں، انسانیت کی بے توقیری، اخلاقی بے بسی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل، ظلم و بربریت، خوف، زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

افسانہ ''دام وحشت'' میں بھی معاشرے میں پروان چڑھنے والی بربریت، دہشت گردی وغیرہ کو بیان کیا۔اسی طرح افسانہ ''بے خواب پلکوں پر ٹھہری رات'' میں لالچی و مفاد پرست حکمرانوں کی کارستانیوں کو بیان کیا۔افسانہ ''ریت کی دیوار'' میں بھی افسر شاہی اور حکمران طبقے کی بے حسی اور عوام کے ساتھ ان کی لاتعلقی کو بیان کیا گیا ہے۔افسانہ ''خوب ہارا''، ''قید سے بھاگتے ہوئے'' بھی سیاسی شعور سے لبریز افسانے ہیں۔

مندرجہ بالا جدید افسانہ نگار کے ہاں سیاسی شعور کی عمدہ شکل ملتی ہے۔ان افسانہ نگاروں نے اپنے اس عہد کے ان تمام مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی جو سماج میں سیاست کے زیر اثر پیدا ہوئے۔اسی طرح جاوید انور آج کے دور کے جدید افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں میں بھی سیاسی شعور کہیں نظر آجاتا ہے۔فرد، ادب، ریاست اور سیاست کا تعلق ہر زمانے میں ساتھ رہتا ہے۔آپ نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کی سیاسی

صورتحال کے چند گوشے کو اجاگر کیا ہے۔

جاوید انور کے ہاں درج بالا جدید افسانہ نگاروں کی طرح سیاسی شعور جھلکتا نظر آتا ہے، انہوں نے بھی یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آج کی سیاست میں عوام کے کن مسائل کا سامنا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی دکھایا کہ اعلیٰ طبقہ کس طرح آج کے دور میں جاگیر دارانہ سوچ کو ختم کرنے میں ناکام دکھائی دیتا ہے۔ طبقاتی تقسیم، مذہب، سیاست، معاشرت ہر معاشرے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔آپ نے اپنے افسانے ''برگد'' میں اس بات کو اجاگر کیا کہ ذات پات کا فرق روا رکھ کر غریب کا استحصال کیا جارہا ہے۔آپ نے اپنے افسانے میں بتایا کہ جاگیر داروں کا رعب نچلے طبقے کو ذہنی غلام بنا دیتا ہے۔ غریب اپنی اولاد کی فیصلوں میں بھی آزاد دکھائی نہیں دیتا ان تمام مسائل کی نشاندہی افسانہ ''برگد'' میں کی گئی ہے۔

درج بالا جدید افسانہ نگاروں کے ہاں بھی جابجا ہمیں طبقاتی تقسیم، معاشرے میں چوہدری کا کردار، زندگی کی افراتفری، نچلے طبقے کی مظلومیت کو اجاگر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جاوید انور ''بھٹی'' افسانے میں جبر واستبداد کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ زندگی جو پر سکون سمندر کی طرح ہے اچانک سے ایک قتل ہو جانے پر بھٹی کی طرح جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ یہ قتل کسی چیز کے حسد میں نہیں ہوتا ہے بلکہ غریب کا قتل چودھریوں کی نام نہاد غیرت کے نام پر ہوتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ کو غریبوں کا استحصال ہر دور میں نظر آتا ہے۔آپ نے اپنے افسانے میں بتایا کہ یہ طبقہ معیشت پر پوری طرح سے قابض ہے۔ ملک کی آدھے سے زیادہ آبادی جاگیر داروں اور وڈیروں کی غلام ہوتی ہے۔ محکوم طبقہ اس قدر ناانصافیوں کی چکی میں پس چکا ہے کہ وہ اپنی حالت پر قناعت کر لیتا ہے۔مزاحمت کے تمام راستوں کو چھوڑ کر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر راضی ہو جاتا ہے کیونکہ جاگیر دارانہ نظام میں انسانی جان کی قیمت بہت ارزاں ہوتی ہے۔

جاوید انور نے افسانہ ''مہربانی'' میں اس کی جھلک دکھائی ہے کہ کس طرح طاقتور طبقہ غریب طبقے کا استحصال کرتا ہے۔آپ نے مہربانی افسانے میں جاگیر دار طبقہ کے اس رویے کو اجاگر کیا جو غریب طبقے کے ساتھ روا رکھتے ہیں اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو سلب کر لیتا ہے۔ غریب طبقہ کام کر کے ملنے والی اجرت کو اپنا حق سمجھنے کی بجائے مہربانی تصور کرتا ہے۔ جاگیر دار طبقہ غریب کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا اپنا فرض سمجھتا ہے وہ غریب کو معاشی طور پر مستحکم نہیں ہونے دیتا۔آپ نے جہاں غریب کے حقوق کی پامالی کو موضوع بنایا وہیں آپ نے آج کے جدید دور میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کی صورت میں آنے والی تبدیلیوں کا بھی اپنے افسانے ''نیرنگی'' میں ذکر کیا۔آپ نے بتایا کہ غریب جاگیر داروں اور وڈیروں کی غلامی سے تنگ آکر شہر کا رخ

کرتا ہے خود کو معاشی طور پر مستحکم کرتا ہے اس سے اس کی سوچ بدلتی ہے۔اس میں آزادانہ زندگی گزارنے کا شعور بیدار ہوتا ہے،اس طرح جاگیر دارانہ نظام کو ٹھیس پہنچتی ہے۔جاوید انور نے اپنے افسانوں میں جہاں طبقاتی تقسیم کے تضاد کی مختلف صورتوں کو اجاگر کیا وہیں افسانہ نیرنگی میں دکھایا کہ تعمیر نو کی طرف بڑھنے کی رفتار میں تیزی آئی ہے۔لوگوں نے خود کو جدید دور کی سہولیات سے فائدہ اٹھا کر معاشی طور پر خود کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے۔

جاوید انور چونکہ کرشن چندر،احمد ندیم قاسمی،بلونت سنگھ اور منشایاد کا زیادہ شوق مطالعہ کرتے ہیں اور ان سے براہ راست متاثر ہیں،اسی لئے ان کے افسانوں میں جابجاان کا اثر معلوم پڑتا ہے۔اسی بناپر جاوید انور نے اپنے افسانوں میں سیاسی زندگی کے معاصر رویوں کی عکاسی بھی کی ہے۔

ان کا افسانہ ''مہابند''گہری سیاسی سوچ کا آئینہ دار ہے۔اس میں انسانی زندگی کو جنگل کی زندگی کی صورت میں پیش کیا ہے آپ نے جنگلی جانور شیر کے ذریعے معاصر حکومتی پالیسیوں پر طنز کیا ہے کہ آج کے دور میں جنگل کا بادشاہ شیر کی طرح حکومت کٹھ پتلی کی طرح کرتا ہے۔ہر انسان اپنی من مانی کر رہا ہے۔''حبس'' افسانے میں حکومتی نااہلی کو بھی دکھایا گیا ہے آپ نے دکھایا کہ طاقتور کو ہر دور میں اہمیت دی جاتی ہے اس کی ہر بات سنی اور مانی جاتی ہے،جبکہ غریب اور متوسط طبقے کے لیے سخت اصول و قوانین بنائے جاتے ہیں۔اسی طرح جاوید انور نے سیاست کے عام آدمی کی زندگی پر اثرات کو اجاگر کیا ہے۔''دشتِ وحشت''افسانے میں حکومتی سطح پر استحصال کی کیفیت کو اجاگر کیا ہے کہ کس طرح حکومتی ادارے اور ریاستی ادارے آپس میں مل کر کرپشن میں ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں۔آپ نے افسانے ''دشتِ وحشت''میں ریل کے سفر میں تمام اخلاقی و سماجی برائیوں اور ناانصافیوں سے پردہ اٹھایا ہے کہ کس طرح وہ محکمے جو انسان کی جان و مال کی حفاظت پر معمور ہیں ان غیر قانونی کاموں میں ملوث ہوتے ہیں جو انسانیت کے لیے سم قاتل ہے۔

اسی طرح جدید افسانہ نگاروں کے ہاں سیاسی شعور کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔رشید امجد،منشایاد،زاہدہ حنا، مظہر الاسلام، احمد داؤد،احمد جاوید، اسد محمد خان،اعجاز راہی،آصف فرخی، مبین مرزا کی طرح جاوید کے افسانوں میں سیاسی شعور کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔آپ نے معاشرے کے چیدہ چیدہ مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی جو سیاسی انتشار کی صورت میں عام آدمی کو لاحق ہوتے ہیں۔آپ نے امیر طبقہ کی ناانصافیوں کے سبب غریب کے استحصال کو بھی بخوبی بیان کیا۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۱۱

۲۔ فہیم اعظمی، ڈاکٹر، آراء، مکتبہ صریر، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۳

۳۔ Quincy wright,The Study of International Relation,New York, 1995,p133

۴۔ سید نذیر نیازی، سیاسیات ارسطو، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۵

۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۲

۶۔ راجندر سنگھ بیدی، ادب اور سیاست، مشمولہ ادب، زندگی اور سیاست، (مرتبہ) محمد خاور نوازش، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۴۰۰

۷۔ وارث علوی، تیسرے درجے کا مسافر، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۶

۸۔ ابراہم جلیس، (انٹرویو) مشمولہ ادب اور ادبی مکالمے، از شفیع عقیل، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۶

۹۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵۲

۱۰۔ احمد جاوید، سن تو سہی، مشمولہ گواہی، ص ۸

۱۱۔ اعجاز راہی، سہیم ظلمات، ص ۲۸

۱۲۔ مظہر الاسلام، کاندھے پر کبوتر، مشمولہ گواہی، ص ۱۷

۱۳۔ منصور قیصر، ایک بانسری ہزار نیرو، مشمولہ گواہی، ص ۸۰

۱۴۔ انور سجاد، آج ۴، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص

۱۵۔ انتظار حسین، خواب اور تقدیر، مشمولہ کچھوے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۵

۱۶۔ رشید امجد، الجھاؤ، مشمولہ ست رنگ پرندے کے تعاقب میں، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۸

۱۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پت جھڑ میں خود کلامی، اشاعت پبلیکیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۸

۱۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، آخرت ایکسپریس، مشمولہ ایک ہی کہانی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۰

۱۹۔ خالدہ حسین، مکڑی، مشمولہ مزاحمتی ادب اردو، (مرتب) رشید امجد، ص ۱۸۵

۲۰۔ انتظار حسین، ریزروسیٹ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۵۴

۲۱۔ مبین مرزا، خواب یار انسان، مشمولہ خوف کے آسمان تلے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۹

۲۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، اردو افسانے میں عصری آگہی، مشمولہ تخلیقی ادب، نمل، اسلام آباد، ص ۳۷۸

۲۳۔ مسعود مفتی، شناخت، مشمولہ ۱۱/۹ پاکستانی اردو افسانہ (انتخاب و تجزیہ)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۸۱

۲۴۔افتخار نسیم، پردیس (افسانہ)، مشمولہ ۱۱/۹اور پاکستانی اردو افسانہ، (مرتبہ) نجیبہ عارف، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۸۷

۲۵۔پروین عاطف، اینڈ آف ٹائم، پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۱۷۸

۲۶۔علی حیدر ملک، دہشت گرد چھٹی پر (افسانہ)، مشمولہ پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵۶

۲۷۔نجیبہ عارف، ۱۱/۹اور پاکستانی اردو افسانہ،، ص ۴۶

۲۸۔راحیلہ بشیر، ڈاکٹر، اردو افسانے میں خیر و شر کا تصور (قیام پاکستان کے بعد) فیصل آباد، مثال پبلیشرز، ۲۰۱۵ء، ص ۲۳۲

۲۹۔جاوید انور، برگد (افسانہ)، مشمولہ برگد، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۸۷

۳۰۔جاوید انور، برگد، ص ۸۸

۳۱۔ایضاً، ص ۹۰

۳۲۔جاوید انور، بھٹی، (افسانہ) مشمولہ برگد، ص ۲۳، ۲۲

۳۳۔محمود ظفر ہاشمی، برگد ایک تعارف، (مضمون) مشمولہ برگد، ص ۲۴

۳۴۔جاوید انور، مہربانی، (افسانہ) مشمولہ سرکتے راستے، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۷۵

۳۵۔ایضاً، ص ۷۸

۳۶۔جاوید انور، نیرنگی، (افسانہ) مشمولہ سرکتے راستے، ص ۱۲۳

۳۷۔ایضاً، ص ۱۲۳

۳۸۔ایضاً، ص ۱۲۵

۳۹۔رشید امجد، ڈاکٹر، یافت و دریافت، ص ۹۰

۴۰۔جاوید انور، مہابندر، (افسانہ) مشمولہ سرکتے راستے، ص ۸۳

۴۱۔ایضاً، ص ۸۴

۴۲۔جاوید انور، مہربانی، (افسانہ) ص ۷۸

۴۳۔ایضاً، ص ۷۹

۴۴۔ایضاً، ص ۷۹

۴۵۔وارث علوی، تیسرے درجے کا مسافر، ص ۱۸۶

۴۶۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ماحول اور مزاج، مشمولہ ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۹

۴۷۔ جاوید انور، برگد (افسانہ)، ص ۹۰

۴۸۔ ایضاً، ص ۹۰

۴۹۔ جاوید انور، دشت و وحشت، (افسانہ) مشمولہ برگد، ص ۹۶

۵۰۔ ایضاً، ص ۹۷

۵۱۔ جاوید انور، مہربانی، (افسانہ)، ص ۹۷

۵۲۔ ایضاً، ص ۹۷

باب چہارم

جاوید انور کے افسانوں میں ادبی زندگی کی عکاسی

زندگی مسلسل ارتقا کا دوسرا نام ہے۔ زندگی کے اس مسلسل ارتقا میں انفرادیت اور اجتماعیت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ارتقاء حیات میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ادب اسی انسانی زندگی کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے، زندگی میں کچھ مقاصد ایسے ہیں جن کی تکمیل کیلئے ادبی تخلیقات کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ ان تقاضوں کا تعلق فطری جبلتوں سے ہوتا ہے جو قدرت کی طرف سے بندے کو ودیعت کی گئی ہیں۔ انسان اپنی عادت سے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے داخلی واردات کو دوسرے انسانوں پر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ یہ جذبہ انسان کو ادب کی طرف مائل کرتا ہے۔ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، دوسرے انسانوں سے تعلق رکھے بغیر اس کے لئے زندہ رہنا محال ہے۔ ایک معاشرے میں رہتے ہوئے انسان کے اعمال و افعال ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں، اس گروہی جبلت میں جب ذہنی اور جذباتی طور پر ایک انسان دوسرے انسان سے مربوط ہوتا ہے تو وہ اپنے جذبات و خیالات کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کا سہارا لیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انسان کا ارد گرد کا ماحول، گردوپیش، مناظر فطرت سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ان تمام محرکات کے اظہارِ بیان کے لیے ادب کا سہارا لیا جاتا ہے۔

لیکن زندگی کی ان تخلیقات اور مروجہ قدروں کے ساتھ فنی اور جمالیاتی اقدار کا ہونا بھی لازم و ملزوم ہے کیونکہ بڑے ادیب و شعرا کی تخلیقات کو اسی بنا پر دوام حاصل ہے۔ جہاں انہوں نے بنیادی قدروں اور انسانی مسائل کو ادب میں جگہ دی وہیں انہوں نے اپنے خلوص اور جذبے کی رنگ آمیزی کو بھی شامل کیا یہی امتزاج ان کی عظمت و رفعت کا باعث بنا۔

ادب اور زندگی کے بارے میں مختلف مدارس نے جنم لیا بعض لوگوں کی رائے تھی کہ ادب کی دو مختلف حیثیتیں ہیں ایک سماجی اور دوسری فنی۔ ان کے نزدیک اگر ادب میں سماجی مسائل و حقائق کو بیان کیا جائے گا تو ادب اپنی فنی چاشنی کو محدود کر دے گا۔ اس طرح انیسویں صدی کے اوائل میں فرانس میں ایک تحریک نے جنم لیا جس نے ''ادب برائے ادب'' کا نعرہ لگایا جن کے نزدیک ادب کا سب سے بڑا مقصد تخلیق حسن ہے کیونکہ آرٹ انسان کی شخصیت کا اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ انفرادی احساسات و جذبات کا امین بھی ہے۔ اس طرح ادب بذات خود مقصد ہے، اس طرح ادب کی حیثیت محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ ادب کی سماجی حیثیت ختم ہو جاتی ہے لیکن اصل میں ادب برائے ادب کے پیروکار بھی اپنی تخلیقات زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں سے کنارہ کشی اختیار

نہیں کر سکے وہ اپنی تخلیقات میں سماجی و معاشرتی حقائق کو بیان کئے بغیر نہ رہ سکے۔ آسکر وائلڈ جمالیات اور فن کا امین کہلاتا ہے۔ اس نے بھی بلبل اور گلاب لکھتے ہوئے سماجی زندگی اور طبقاتی فرق کو نظر انداز نہ کیا جس میں ایک امیر لڑکی اپنے غریب عاشق کا تحفہ پھول، اس نے بلبل کے خون جگر سے سینچ کر اسکو پیش کیا تھا، لڑکی لینے سے صرف اس لیے انکار کرتی ہے کیونکہ اس کے امیر عاشق نے اس کو قیمتی ہیرے اور جواہرات لا کر دیئے ہوتے ہیں۔

آسکر وائلڈ بقول ایک نقاد جمالیات کے بے جان خدا سے نکل کر زندگی کی حقیقتوں کو بیان کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لئے دنیا کے کسی بھی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ کوئی بھی ادب اپنے دور کے حالات و واقعات سے دامن نہیں بچا سکتا ہے لیکن جہاں ادب زندگی کی ترجمانی کو ضروری قرار دیتا ہے وہیں اس کے فنی اور جمالیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح افلاطون کے خیال میں بھی ادب کا مقصد اچھے شہری پیدا کرنا ہے یہ تبھی ممکن ہے جب ادب مواد اور ہیئت دونوں کا اخلاقی اور تعلیمی تعلق ہو۔ ادب کو انسانی زندگی کی اصلاح اور قوت کا باعث ہونا چاہیے کیونکہ انسان کی پہچان اس کی تہذیب سے ہوتی ہے۔ ادیب اپنے منصب سے آگاہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایسا ادب تخلیق کرنے کی سعی کرتا ہے جو زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی طاقت رکھتا ہو کیونکہ ادیب تمام انسانوں سے زیادہ حساس ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقتوں سے متعلق گہرا مشاہدہ رکھتا ہے۔

اس لیے شاعر یا ادیب اپنے ارد گرد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ وہ انسان کے تمام سماجی، معاشی، اقتصادی واخلاقی مسائل کو اپنے تخلیقات کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اس لیے ادب زندگی کی از سر نو تخلیق کا دوسرا نام ہے کیونکہ ادیب اپنی تخلیقات کے لیے مواد زندگی کی بو قلموں سے حاصل کرتا ہے۔ ادب کا تعلق سماج سے ہوتا ہے اس لیے ادب کو کسی مخصوص موضوع کا پابند نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ زندگی بڑی متنوع ہوتی ہے۔ اس میں سیاسی، سماجی، مذہبی، اقتصادی، معاشرتی، معاشی تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ یہی کیفیات اور تنوع ادب کا موضوع ہے لیکن آج کا ادیب و شاعر مصنف اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کچھ کے نزدیک مذہب اور اخلاق کو ادب کا موضوع بنانا سم قاتل سمجھا جاتا ہے جبکہ ادب کی تاریخ میں مذہب، اخلاق، آرٹ میں ہمیشہ ایک مضبوط و مربوط تعلق رہا ہے۔ جیسا کہ ملٹن کی ''فردوس گم گشتہ'' اور دانتے کی ''مقدس طربیہ'' مذہبی نوعیت کی کتابیں ہیں، اسی طرح تصوف کا اردو اور فارسی شاعری پر بھی گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔

مولانا روم اور علامہ اقبال کی شاعری میں بھی مذہب اور اخلاق کی چاشنی ملتی ہے۔ غرض زندگی سے

متعلق ہر موضوع چاہے وہ فلسفہ و فکر، مذہب، اخلاق، سیاست یا اقتصادیات سے متعلق ہوں ادب کا موضوع ہے۔ شاعر، ادیب زندگی کے حقائق سے عام فرد کو آگاہ کرتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کے بارے میں عامیانہ خیالات کے حامل نہیں ہو سکتے ہیں۔ ادیب یا شاعر کو یہ بات سمجھنی ہوتی ہے کہ معیاری ادب زندگی کے اجتماعی مسائل اور اخلاقی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ انور شیخ کے الفاظ میں

> ''ادب کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہ اپنے سماج کا ترجمان ہوتا ہے جو ادیب اپنے معاشرے کی جتنی بہتر عکاسی کر سکے۔ اس کا مقام اتنا ہی بلند ہوتا ہے۔ ادیب عام طور پر مصلح کا رول اختیار نہیں کرتا، جب وہ اپنے دیس کا تمدنی خاکہ پیش کرتا ہے تو معاشرتی امراض کا علاج خود بخود سمجھ میں آنے لگتا ہے۔''(۱)

اس لیے ہمارے ادیب اور شاعر کو ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے جو ہماری نئی نسل کی علمی و فکری روئیدگی کا سامان بھی کرے۔ ادیب کو عصری عہد کے تقاضوں اور مسائل کو سمجھنا ہوگا کیونکہ اگر ادب زندگی تو ادیب کو سوچنا ہوگا کہ ہمارے سماجی سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی مسائل وہی ہیں جو عالمی سطح پر منظر عام پر آرہے ہیں۔ ان کا سد باب بھی کیا جانا ضروری ہے۔ ادیب کو اس بات کا بھی سراغ لگانا ہوتا ہے کہ انسان کس حد تک اپنی فطری و اصلی عمرانی معاشرت کا سراغ پا چکا ہے کہ نہیں اس لیے ادیب کو یہ حقیقت جاننے کے لیے فلسفہ اور ادب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اپنے خیالات و نظریات کو پیش کرنے کے لئے بہترین پہلوؤں کو اپنایا جاتا ہے۔ ہمارا عصری عہد ادیب کو سچائی اور موجودات کا منظر پیش کر رہا ہے لیکن ان کے اندر علمی سامراجیت اور بورژوائی کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہونے کے برابر ہے۔ کچھ ادیب منفی رجحانات سے بالاتر ہو کر قابل قدر ادب تخلیق کرنے میں کوشاں ہیں۔ ادیب جہاں انسانی زندگی کے سماجی و معاشی مسائل کو سامنے لانے میں کوشاں ہے وہیں ان کا ممکنہ حل بھی پیش کرنا چاہیے۔

الف:۔ ادبی زندگی سے وابستہ کردار اور کہانیاں:

کہانی ہماری تہذیب و ثقافت کا حصہ ہے۔ انسانی تہذیب کی ترقی کے ہر دور میں مشرق سے مغرب شمال سے جنوب تک چلے جائیں تو قصہ گوئی بدستور ملے گی کیوں کہ کہانیاں سننے کا رواج بچپن سے شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ دادی، نانی بچوں کو کہانیاں سناتی تھی۔ جنوں، پریوں، علی بابا چالیس چور، سندباد کی کہانی یا کلیلہ و دمنہ کی کہانیاں وغیرہ۔ کہانیوں سے نہ صرف نشاط کا پہلو وابستہ تھا بلکہ کہانیوں سے اس دور کی تہذیب و ثقافت، رسم و

رواج، عادات واطوار کی معلومات بھی ملتی تھی۔ کہانیاں صرف تفریح طبع کے لیے نہیں سنائی جاتی۔ بلکہ کہانیوں سے انسان میں انسانیت پیدا ہوتی ہے۔ کہانیوں میں موجود کرداروں کے ذریعے انسانوں کے کارناموں سے آگاہی دلائی جاتی ہے۔ کارناموں کے ساتھ ساتھ ناکامیوں کو بھی سامنے لایا جاتا ہے۔

اس طرح کہانیاں انسان کے اندر ترقی کرنے کا جذبہ پیدا کرتی، انسان کو حالات وواقعات سے آگاہی دلاتی ہیں تاکہ انسان کے اندر شعور پیدا ہو، وہ اپنے معاشرے کے اصول وضوابط کو سمجھتے ہوئے اپنے لیے اصول وضوابط مرتب کرے۔ اس طرح کہانی سننے اور سنانے کا رواج ہمیشہ چلتا رہے گا۔ اسی طرح امیر حمزہ جو کہ ایک طویل داستان ہے، اس نے نسائی کرداروں کو اردو ادب میں انوکھے انداز سے متعارف کروایا۔ اس داستان کے کردار جنگیں لڑتے مردانہ فیصلوں میں اپنی رائے رکھتے ہیں ان کے اندر فیصلے کی قوت دکھائی جاتی ہے۔ اس طرح کہ جس سے مردانہ کردار کو ہی طاقت کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ کیوں کہ دو صدیاں پہلے نظر دوڑائی جائے تو عورت کو کمتر سمجھا جاتا تھا۔ مرد کی بالادستی قائم تھی، تمام فیصلوں کا حق مرد کو دیا جاتا تھا۔ جب یہ داستان انیسویں صدی کے نصف آخر پر منظر عام پر آئی، تو سماجی رسوم ورواج کے خلاف تھی۔

اردو کی تاریخ میں داستان امیر حمزہ کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ انیسویں صدی کی بات کریں تو تب برصغیر میں برطانوی راج کی آمد سے مغربی تعلیم کا رواج عام ہوا۔ معاشرہ صنعتی دور میں قدم بڑھانے لگا تو اس تبدیلی نے اردو ادب کو بھی متاثر کیا اردو ادب کے کردار اور کہانیاں بدلنے لگیں۔ کہانی ماورائی دور سے نکل کر حقیقت کی عکاس بن گئی۔ کرداروں میں بھی ماورائی عناصر کو کم کر کے حقیقت کے روپ میں دکھایا جانے لگا۔ عورت اور مرد کی تفریق کو کم بیان کیا جانے لگا۔ اردو کے اولین ادبا سجاد حیدر یلدرم اور مرزا عظیم بیگ چغتائی نے عورت اور مرد کے روایتی صنفی کرداروں سے بالاتر ہو کر کہانیاں لکھیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں پڑھی لکھی عقل وشعور والی عورت کو متعارف کروایا اسی طرح ''انگارے'' نے بھی اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کے زیر اثر رکھنے والوں نے بھی کہانی اور اس کے روایتی کردار سے انحراف کر کے اردو ادب میں ان کے کرداروں کو متعارف کروایا جو ماورائی قوت سے مزین نہیں ہوتے۔ بلکہ عام انسان کی طرح اپنے حالات و واقعات میں گھرے ہوتے ہیں۔ ان ادیبوں میں سجاد حیدر یلدرم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔

آج کے دور کا ادیب بھی اپنی کہانیاں اور کرداروں کو حقیقت سے قریب رکھتا ہے۔ اسی طرح جاوید انور کے افسانوں میں ایسے ادبی کردار ملتے ہیں جو عصری دور کے مسائل کو اجاگر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ معاشرے

کی ترقی کے زیر اثر جو معاشی سماجی مسائل ان کو درپیش ہے ان کی عکاسی اپنے افسانوں میں نہایت عمدہ انداز میں کرتے ہیں۔

جاوید انور نے اپنے افسانوں میں ادبی کرداروں کے مسائل، نفسیاتی کیفیات، معاشی و سماجی مسائل کو اپنے افسانوں میں عمدہ طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ جاوید انور نے افسانے ''عجیب لڑکی'' میں ایک ایسے ادبی کردار کو متعارف کروایا ہے جو ادب میں ایسی نثر تخلیق کرنا چاہتی ہے جو آزاد اور طرح دار ہو، جو مصنفہ کی تشفی کا باعث ہو، جس کو پڑھ کر قاری کو مسرت حاصل ہو۔ تو اس کے لیے وہ اپنے بڑے بھائی کے بتائے ہوئے اصول جن کے تحت کوئی افسانہ لکھا جاتا ہے۔ ان سے بالاتر ہو کر لکھنا چاہتی ہے۔ وہ ادب کے بنائے ہوئے اصولوں کی پابند نہیں رہنا چاہتی جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتی ہے۔

> ''مجھے کیا پڑھاتے ہیں، میں نے کوئی رقم پکڑی ہے بے چہرہ پابند تحریریں پیدا کرنے کی فیکٹری لگانے کی میں جانوں اور میری تخلیق۔ بس قاری کی اہمیت ہے، لیکن سچ بتاؤں تو قاری بھی بعد میں آتا ہے۔ پہلے تو میں خود ہوں۔ میری ذات ہے، میرا درون ہے۔''(۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی کردار ایسی تخلیق کرنا چاہتی ہے جو تمام اصول و ضوابط سے بالاتر ہو۔ جس میں اس کی ذات کی تشفی ہو سکے، وہ صاف انکار کر دیتی ہے کہ وہ ان تمام مروجہ اصولوں سے انحراف برتنا چاہتی ہے جن کو اپنا کر تخلیقات میں یکسانیت کا عنصر در آتا ہے۔

جاوید انور کے افسانوں میں ادب اور ادیب کی زندگی کے حوالے سے زیادہ مواد نہیں ملتا۔ البتہ جن افسانوں کا موضوع ادب اور ادیب ہے، ان میں نہایت خوبصورتی سے اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے۔ انہوں نے ادب اور ادیب کے باہمی تعلق اور زندگی سے ان کا جو اٹوٹ تعلق ہے اس پر بھی صراحت سے روشنی ڈالی ہے۔

> ''لاحول ولا قوۃ! آپ کے فارمولے پر چل کر بھٹے کے سانچے سے ایک سی اینٹیں تو تھاپ تھاپ کر ڈھیر لگا سکتی ہوں لیکن آزاد، طرح دار اور میری مکمل تشفی اور قاری تک لیکن تسکین آور ترسیل پر قادر شاہکار تخلیق نہیں کر سکتی۔''(۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کار ایسا ادب تخلیق کرنا چاہتی ہے جو زندگی کی عکاس ہو کیونکہ ادیب کچھ محسوس کرتا ہے اس کو اپنی تخلیق میں شامل کر کے دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس افسانے میں تخلیق کار اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات کو نئے زاویے کی روشنی میں پیش کرنا چاہتی ہے کیونکہ عام زندگی میں ذہنی کاہلی، رسم و رواج یا یکسانیت کی وجہ سے ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے جو معاشرے میں بے رنگی کا موجب بنتا ہے۔ اس

لیے ادیب یا مصنف کو اپنی تخلیق میں نیا رنگ، نیا وجدان، نئی قوت پیدا کرنے کے لیے پہلے سے مروجہ اصولوں سے انحراف کرنا پڑتا ہے۔ جاوید انور کے افسانے ''انوکھی لڑکی'' میں اس بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

''افسانویت کی کمی تو آپ یوں فرمارہے ہیں جیسے پتھالوجسٹ کی رپورٹ دیکھ کر ڈاکٹر کہتے ہیں وٹامن بی کی کمی ہے، یا ہیموگلوبن کی کمی ہے۔ جانے دیں سر۔ دل کی بات کی، دل سے بات کی، اگلے کے دل کو لگی۔۔۔۔۔۔ اور کسے کہتے ہیں ترسیل اور تفہیم آپ نقاد لوگ؟''(۴)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ افسانہ نگار ایک ایسا افسانہ تخلیق کرنا چاہتی ہے جس میں وہ اپنی باطنی کیفیات کا اظہار کر سکے۔ وہ افسانے کے مروجہ اصول جن کے تحت افسانہ لکھا جاتا ہے، ان اصولوں سے پہلو تہی ہو کر افسانہ تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ عجیب لڑکی میں نرمین ایک ایسا ادبی کردار ہے جو کسی صورت قواعد کی پابند ہو کر ایسا ادب تخلیق نہیں کرنا چاہتی جو صرف اصول و قواعد کا مرقع ہو۔ اس کے نزدیک قواعد سے زیادہ مفہوم کی اہمیت ہے اور ایسا افسانہ تخلیق کرنا چاہتی ہے جس میں وہ اپنی ذات کی اندرونی واردات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قاری کی دلی کیفیات سے بھی رسائی حاصل کر سکے۔ جس کو پڑھ کر قاری کی اپنی ذات احساسات کی تشفی معلوم ہو۔ جس کا اظہار ان الفاظ میں ہوتا ہے۔ ''نثر پارہ کہہ لیں عروصی مصرع کہہ لیں، میرا تو کام بن گیانا بس میں خوش میرا قاری خوش اللہ اللہ خیر سلا۔ میں نے گلقند ڈالنی ہے قواعد کی۔''(۵)

عجیب لڑکی افسانے میں ایک ایسا کردار ہے جو ادب کے مروجہ اصول وضوابط سے ماورا ہو کر ادب تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ وہ ان تمام ادبی قواعد وضوانط کے خلاف بغاوت کرنا چاہتی ہے جن کی پابندی کے بغیر کوئی ادیب یا تخلیق کار اپنی تخلیق ترتیب نہیں دے سکتا۔ اس کردار کے نزدیک تخلیق کو گنے چنے الفاظ کا پابند نہیں بننا چاہیے بلکہ آزاد ادب تخلیق کرنا چاہیے جو تمام پابندیوں سے آزاد ہو کر مکمل مفہوم دیتا ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کو قاری کے سامنے سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کر دے۔ جیسا کہ

''ایک دن ایک بہت مستند اور نابغہ روزگار شاعر فرمانے لگے کہ علامت کے بغیر شاعری بے معنی ہے ورنہ تو بندہ سیدھے سدھار کہہ دے کہ 'مجھے تم سے محبت ہے!'۔
میرا جی چاہا کہ عرض کروں، کہ میرے نزدیک تو یہ بہت اعلیٰ شاعری ہے۔
'مجھے تم سے محبت ہے''(۶)

عجیب لڑکی میں موجود کردار اپنی تخلیق سے متعلق جواز پیش کرتی ہے کہ ادب کی تاریخ میں صرف انہی لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جو اپنے عہد کے مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ادب کو صرف لفظوں کا

استعارہ، تشبیہات کا بناؤ سنگھارہ پہنانا مقصد نہیں ہوتا ہے۔ادیب کا کام معاشرے کے مسائل وحالات کو اجاگر کرنا اور ان کے حل کا جواز پیش کرنا ہوتا ہے۔ معاشرے کے حالات و واقعات کو لفظوں میں اس طرح بیان کرنا کہ قاری تک معاشرے کی حقیقی صورت حال پہنچ جائے۔ لفظوں کے الجھاؤ سے صرف داد وصول کرنا ادب یا ادیب کا مقصد پورا نہیں کرتا۔اس لیے ادیب جتنا سادہ اور بامقصد مفہوم کے ساتھ کہانی تخلیق کرے گا۔ قاری کے نزدیک وہ فن پارہ زیادہ دلعزیز ہوگا۔

اسی طرح ''عجیب لڑکی''افسانے میں جاوید انور معاشرے کی نفسیات کو بھی اپنے کردار کے ذریعے اجاگر کرتے ہیں۔ بعض دفعہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو ان کی زندگی میں وہ پذیرائی یا مقام حاصل نہیں ہو سکتا ہے لیکن جب وہ اس دنیا فانی سے کوچ کرتے ہیں تو ان کے فن پاروں کو اہمیت دی جانے لگتی ہے۔ان کے اعزاز میں تقریبات مرتب کی جاتی ہیں۔اس افسانے میں بات کی عکاسی نہایت عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ ''وہ کسی نے اپنے تئیں فالتو لکھ کر پھینک دیا اور اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے جھاڑ پونچھ کر چھپوا کر شاہکار تخلیق قرار دیا۔ (۷)''

اس افسانے کا کردار نرمین اپنے بھائی کو یہ بات باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ جو کہانی تخلیق کر رہی ہے بیشک وہ مروجہ اصولوں وضوابط پر پورا نہیں اترتی لیکن مفہوم کی تمام تر خوبیوں سے مزین ہے۔ کسی کا لکھا ہوا ادب یا فن پارہ کبھی بے کار نہیں ہوتا۔آج نہیں تو کل کیا پتہ شاہکار ہو۔ جیسا کہ وہ اپنے بھائی سے کہتی ہے کہ: ''کیا پتا میری آج کی آپ کے بقول یاوہ گوئیاں کل کے شاہکار ہوں۔''(۸)

اس طرح مصنفہ نرمین کے آخر میں مرزا غالب کی مثال بھی پیش کرتی ہیں کہ جو معانی کو شروع میں اہمیت نہیں دیتے تھے بعد میں مفہوم و معانی کو ادب میں شامل کر کے پذیرائی حاصل کرتے ہیں اور آج کے جدید دور کا تقاضا بھی ہے کہ ادب کی تخلیق میں معنی و مفہوم کا موجود ہونا ضروری ہے کیونکہ آج کا ادیب اور شاعر ادب برائے زندگی کا پیروکار نظر آتا ہے۔ لیکن ادب میں فنی محاسن سے بھی پہلو تہی نہیں برتی جاسکتی ہے۔اس لیے مفہوم و معنی کے ساتھ فنی محاسن کی چاشنی بھی ضروری ہے۔ عظیم ادب وقت کے ساتھ مرتا نہیں ہے بلکہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے کیونکہ کوئی بھی ادب کسی بھی عہد میں حال کا آئینہ ،ماضی کا آمین اور مستقبل کا اشارہ ہوتا ہے۔

آج کے جدید دور میں سوشل نیٹ ورک کی تیز رفتاری نے ادب اور ادیب کو بھی بہت متاثر کیا۔ادب کی سمجھ بوجھ رکھنے والا ادیب سوشل نیٹ ورک پر شہرت حاصل کرنے میں اس قدر مگن ہے کہ وہ نئے آنے والے ادیبوں کی راہنمائی کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ''کوئی پتھر'' افسانے میں ادیبہ لڑکی کو ادب میں دلچسپی رکھتی

ہے، معاشرے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ادب تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ایک اچھی ادیبہ بننے کے لیے وہ ادیبوں سے راہنمائی لینے کی کوشش کرتی ہے لیکن سوچ میں پڑ جاتی ہے کہ وہ کس قسم کے ادیب سے راہنمائی حاصل کرے۔

''جو کام کے لکھنے والے سنجیدہ صفت خواتین و حضرات تھے وہ تو پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے تھے، اپنے آپ میں مگن تھے۔

مست الست

جو درمیانہ درجے کے تھے وہ بس اپنے جوگے تھے

اور تیسرے والے اسی کے بھائی بند تھے۔ ٹکڑا ادھر سے جوڑا ٹکڑا ادھر سے پکڑا۔''(۹)

اس اقتباس میں تین قسم کے ادیبوں کا ذکر ہے۔پہلی قسم کے وہ ادیب جو ادب کی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں لیکن وہ اپنی ذات میں اس قدر مصروف نظر آتے ہیں کہ وہ نئے لکھاریوں کو قریب سے بھی نہیں گزرنے دیتے۔دوسری قسم کے وہ ادیب جو کسی کی راہنمائی نہیں کر سکتے ہیں وہ اتنا ہی جانتے ہیں جو ان کے اپنے لیے اور تیسری قسم ان ادیبوں کی ہے جو ادھر ادھر سے مواد لے کر اپنی تخلیق مرتب کرتے ہیں اور سوشل نیٹ ورک پر ڈال کر پذیرائی حاصل کرتے ہیں۔ادب کی تخلیق میں ادیب معاشرے کی تربیت کا ضامن ہے۔لیکن آج کے جدید دور میں ادیب شہرت کے طوفان میں اس قدر غرق ہے کہ اس کے نزدیک ادب صرف شہرت کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔پہلے دور کے ادیب اور شعرا نئے آنے والے ادیبوں کی راہنمائی کرتے تھے جبکہ آج کے دور میں ادیبوں کے پاس کسی کو شاگردی میں لینے کا وقت ہی درکار نہیں۔نئے آنے والے ادیبوں کو بھی اپنے ادب کی پذیرائی کے لیے کسی بڑے ادیب یا مصنف کی آرا کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی وہ ادب سوشل نیٹ ورک جیسے فیس بک وغیرہ پر ڈال دیتے ہیں۔لائک گن گن کر ادیب اپنی تخلیق کا مقام متعین کرنے میں مصروف ہے۔آج کے جدید دور میں کتاب پڑھنے کا رواج زوال پذیر صورت اختیار کر گیا۔اب ادبی کہانیاں افسانے، صرف سوشل نیٹ ورک کی زینت بن گئے۔''فورم کے پکے گاہک سو پچاس لائک مارتے اور دس بیس تبصرے داغ دیتے جو زیادہ تر ''ویری نائس''اور ''زبردست افسانہ''ٹائپ ہوتے۔''(۱۰)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کا ادیب یا شاعر اپنی ذات میں گم ہو کر رہ گیا ہے، کسی بڑے انسانی مقصد سے دلچسپی ختم ہوتی جا رہی ہے۔جس کی وجہ سے وہ اپنی ذات کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے، کیونکہ اجتماعی زندگی کسی نصب العین سے خالی ہے۔ادیب ہی ادب سکھانے کا ذریعہ ہے، معاشرے کی تربیت کرتا ہے، معاشرے کی گھسی پٹی تصویر سے نیا رخ کشید کرنا ادیب کا منصب ہوتا ہے۔اس کے لیے ادیب کو خود ادب سے آشنا ہونا ضروری ہوتا

ہے لیکن آج کے جدید دور میں ادیب بھی ہر مسئلے کا حل گوگل کر رہا ہوتا ہے۔ادیبوں نے اپنی اپنی کہانیوں کی ایک الگ دنیا آباد کر رکھی ہے۔ادیب پرنٹیڈ رسائل کی جگہ اب سوشل نیٹ ورک پر اپنی تحریریں پیش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ''سب سے اونچے درجے کے نقاد جنہیں اس دشت کی سیاحی میں کچھ کم ایک دہائی ہو گئی تھی گوگل کا اڑن کٹھولا خوب خوب اڑاتے اور اپنی دھاک بٹھاتے۔''(۱۱)

مفکر،ادیب، کسی بھی معاشرے کے راہبر ہوتے ہیں۔ادیب الفاظ کے جادو سے عوام کے ذہن کو بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔شعوری یا لاشعوری طور پر انسان کو سوچنے پر اکساتا ہے۔ادیب معاشرے میں مایوسی کے اندھیروں سے نجات دلانے کا سامان کرتا ہے۔سائنس ایجادات کرتی ہے تو ادب ان کا بہتر استعمال سکھاتا ہے۔ادب انسان کو انسان بناتا ہے،اس لیے ادیب کو آج کے عصری دور میں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہونے کی اشد ضرورت ہے تاکہ معاشرے ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

ب:۔ادبی طبقے کے نفسیاتی و تخلیقی مسائل:

کسی بھی قوم یا معاشرے کو بنانے میں ادیب کا اہم کردار ہوتا ہے۔کیونکہ ادیب معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔اپنے احساسات سے معاشرے کے مسائل و مشکلات، مصائب خوشیوں و مسرت کو محسوس کر کے اپنی تخلیقات میں بیان کرتا ہے۔زندگی کے نشیب و فراز جو عام طور پر فرد کو متاثر کرتے ہیں ایک ادیب کے نزدیک پورا معاشرتی نظام ان تغیرات کے زیر اثر آسکتا ہے۔ادیب معاشرے میں جو ادب تخلیق کرتا ہے اس کا مقصد صرف وقت گزاری، قصے، کہانیاں نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشرے کے روپ و بہروپ کی عکاسی کرتا ہے۔ادیب معاشرے کی تربیت کا ضامن ہوتا ہے۔ادیب معاشرے میں موجود مسائل کو ہر رخ سے جانچتا ہے۔ہر پہلو کا گہرائی سے مشاہدہ کرتا ہے۔ہر کردار کے ظاہر و باطن کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ادیب معاشرے کی گلی سڑی تصویر سے ایک نیا زاویہ سامنے لاتا ہے کیونکہ ادب میں سماجیات اور ثقافتی اجتماعات کی تمام سرگرمیاں اپنے عکس کی عکاس اور ترجمان ہوتی ہیں،اپنے ماحول اور معاشرے کی دین ہوتی ہیں۔اس لیے ادب کی تخلیق میں ارتقائی عمل کے حصے کو تیز کرنے کے لیے انقلابی فکر و نظر عصری تقاضا جانا جاتا ہے۔

ادیب اپنے عصر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر نئی قدریں متعارف کرواتا ہے۔نئے سماج کی تعمیر اور نئی پیداروای قوتوں کی ترقی و ترویج میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ادب کا جدید بنیادوں پر استوار ہونا اور انقلابی زاویہ نظر لوگوں کو فطری راہنمائی اور ہم آہنگی میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ادب ایک سماجی عمل ہے،ادیب کا اس

سماجی عمل میں سماجی ذمہ داریوں، عصری عوامل، سیاسی جدوجہد میں منصبی ذمہ داریوں سے انکار ممکن نہیں ہے بلکہ اپنے طریقہ کار اور دائرہ کار کے مطابق عوام اور معاشرے کے عصری حالات و واقعات سے متعلق سوچ و بچار کر کے راہنمائی عطا کرتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں چاہے وہ اقتصادی ہوں، سیاسی ہوں یا سماجی، ان کے لیے روشنی و توانائی کا موجب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اور ادیب اپنے عصر کی سچائی اور حقیقت کو بیان کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔

ادب اور ادیب قومی ہم آہنگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ معاشرے کی ترقی، خوشحالی، ملک کی خود مختاری اور آزادی کا آئین ہوتا ہے۔ لیکن ادب اور ادیب کی ان ذمہ داریوں میں حکومت کی طرف سے رکاوٹ نہ ہو، ادیب کو تحریر و تقریر کی آزادی ہو، اس کے ساتھ ساتھ ادیب کو مالی طور پر مستحکم کرنا، اشاعت و طباعت کے مسائل کو حکومتی سطح پر حل کرنے میں مدد کرنا بہت ضروری ہے۔ لیکن آج کے عصری دور میں اہل قلم کو کسی قسم کی سہولیات میسر نہیں۔ ادیب معاشی مسائل کے باعث بہت سے تخلیقی و نفسیاتی مسائل کا شکار ہے۔

ادیب کے ان مسائل کو جاوید انور نے عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے افسانے ''دروازہ'' میں ادیب کے تخلیقی و نفسیاتی مسائل کی عکاسی ادیب ارشد وحید کے کردار میں نظر آتی ہے جو کہ ایک اچھا افسانہ نگار ہے۔ لیکن وہ معاشی طور پر اتنا مجبور ہوتا ہے کہ وہ دل برداشتہ ہو کر لکھنے کے کام کو فضول کام سمجھتا ہے کیونکہ اس افسانے میں ادیب کی معاشی حالت بہت پست ہوتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کے عوض اتنے پیسے نہیں کما سکتا کہ اپنا گزر بسر اچھے انداز میں کر سکے۔ ان تمام حالات کے پیش نظر ادیب اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پس پشت ڈال کر روزی روٹی کے لیے کوئی اور کام کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ''مجھے کیا دیا اس لکھنے نے، وقت ضائع کرتا ہوں۔ چھوٹی موٹی نوکری ہے۔ ہمیشہ ایسی پوسٹ پر لگتا ہوں کہ رشوت وغیرہ کے چکر سے بچ جاؤں۔''(۱۲)

اسی طرح آگے چل کر یہ افسانہ نگار اپنا موازنہ ایک الیکٹریشن سے کرتا ہے۔ ادیب جو معاشرے کے راہبر ہوتے ہیں لیکن معاشرے میں اس کی تخلیقات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ وہ اپنی روزی روٹی کے چکر میں اپنے اصل منصب سے توجہ ہٹا لیتا ہے۔ ادیب خود کو ایک کمزور اور لاچار انسان سمجھتا ہے اور وحید الیکٹریشن جو دبئی دس سال لگا کر آیا ہے۔ اس کے پاس دنیا کی تمام ضرورت کی اشیا موجود ہوتی ہیں، وہ معاشی طور پر مستحکم ہوتا ہے۔ اس کے پاس پُرآسائش زندگی گزارنے کا سارا سامان موجود ہوتا ہے۔ اس کے بچے انگریزی سکول میں پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ ادیب وحید ارشد کو احساس کمتری کا احساس گھیر لیتا ہے۔ اس کی اس پُرآسائش زندگی کے سامنے اپنی ذات اور تخلیقات کی بے وقعتی کا شدید احساس ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ۔ '' کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے

سارے افسانے لے جا کر اس کے سر پر دے ماروں اور اس کے سارے پیسے، سارے وسائل چھین لوں۔"(۱۳)

اس اقتباس سے ایک ادیب کی نفسیاتی حالت ظاہر ہوتی ہے کہ ادیب معاشی حالات کے ہاتھوں کسی حد تک مجبور ہوتا ہے کہ وہ احساس محرومی کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔اس کی نظر میں اس کی کہانیاں،افسانے سب بیکار کی چیزیں ہیں۔ کیونکہ آج کے جدید دور میں بڑھتی ہوئی ضروریات نے انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔مادیت پرستی کے دور میں ہر انسان بہتر سے بہتر کی تلاش میں گامزن ہو چکا ہے۔ لیکن اس جدید دور میں ادیب کی تخلیقات کی وقعت نہ ہونے کے برابر ہو گئی ہے۔جدید ٹیکنالوجی، سوشل نیٹ ورک نے کتاب کی اشاعت ترویج کو متاثر کیا۔ لوگوں کے پاس کتاب پڑھنے اور خریدنے کا وقت ہی نہیں رہا۔اس لیے ادیب نفسیاتی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ادیب کو وہ پذیرائی نہیں ملتی جو اس کا حق ہوتا ہے۔ایسے میں وہ ذہنی و نفسیاتی طور پر دباؤ کا شکار رہتا ہے۔ادیب بتاتا ہے کہ آج کے اس دور میں ادیب کی کوئی وقعت نہیں۔الیکٹریشن جس کے رشتے سے میری بیوی نے اس وقت انکار کیا تھا،ایک ادیب کو اہمیت دی تھی۔ لیکن آج کے اس مادیت پرستی کے دور میں میری بیوی کو اگر موقع دیا جائے تو وہ ادیب کے حق میں فیصلہ نہیں دے گی۔اس کا اظہار افسانے میں ان الفاظ میں ہوتا ہے۔

> "سچ بتاؤں تو کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر میری بیگم کو اب یہ موقع دوبارہ دیا جائے کہ لطیف الیکٹریشن سے منگنی توڑ کر اردو ادب کے مایہ ناز افسانہ نگار وحید ارشد سے شادی کر لو تو شاید اس کا فیصلہ میرے حق میں نہ جائے۔"(۱۴)

اس اقتباس سے ادیب کی نفسیاتی حالت ظاہر ہوتی ہے کہ ادیب معاشی حالات کے باعث کس قدر ذہنی کشمکش کا شکار ہوتا ہے۔

ادیب معاشرے میں جہاں نفسیاتی مسائل کا شکار ہے وہاں ادیب آج کے عصری دور میں بہت سے تخلیقی مسائل سے بھی دوچار ہے۔ادیب اس جدید دور میں احساس کمتری اور احساس محرومی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے کیونکہ جدید انسان کے پاس ادب کے لیے وقت نہیں ہے۔انٹرنیٹ اور سوشل ویب سائٹس نے ادب کو بہت متاثر کیا ہے۔آج کے جدید دور میں ادیب بھی ادبی پرچوں کی اشاعت و طباعت میں دلچسپی نہیں لیتا ہے۔کیونکہ ادبی رسالوں کی خریداری پر لوگ پیسے خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ سوشل میڈیا پر نوجوان ادیبوں نے اپنی کہانیوں کی دنیا آباد کر رکھی ہے۔ادیب کے پرنٹ رسائل کی جگہ سوشل نیٹ ورک نے لے لی ہے۔نوجوان نسل سوشل نیٹ ورک پر بلاگ اور کہانیوں کی ترویج کرتے ہیں۔جدید دور میں کلاسیکی ادب کو فرسودہ جانا جاتا ہے۔ اس طرح آج کے عصری دور میں رسائل و جرائد کی اشاعت بھی زوال کا شکار ہو چکی ہے۔"ان دنوں ادبی جرائد نہ ہونے کے برابر رہ

گئے ہیں۔"(۱۵)

آج کے عصری دور میں پرانے ادیب، مصنف خود کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کرتے ہیں۔اس کی وجہ سے ان کو بہت سے تخلیقی و نفسیاتی مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔آج کی جدید ٹیکنالوجی انسان کو کم وقت میں اپنی تخلیقات کی اشاعت کا موقع مہیا کرتی ہے۔لیکن پرانے ادیب سوشل میڈیا پر اپنا افسانہ اور کہانی لگا کر شہرت حاصل کرنے کو باعث عار سمجھتے ہیں۔وہ اپنی تخلیقات کو کتابی صورت میں سامنے لانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کے نزدیک سوشل میڈیا پر غیر سنجیدہ لوگ موجود ہوتے ہیں جو ان کی تخلیق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ان کے نزدیک سوشل میڈیا پر نیم حکیم اپنی مرضی کے مطابق تشریح کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ افسانے "دروازہ" میں ادیب خود کو اس بات کا قائل نہیں کر پاتا کہ وہ اپنی تخلیقات کی سوشل میڈیا پر اشاعت کرے۔"کوشش کے باوجود خود کو مائل نہیں کر سکا کہ موبائل ٹیلی فون یا کمپیوٹر میں افسانہ لے کر گھس جاؤں۔"(۱۶)

آج کے جدید دور میں فرد ادبی رسائل اور کتابوں پر پیسے خرچ کرنے کو تیار نہیں۔عام قاری بھی جدید دور میں ادبی پرچے کو وقت نہیں دیتا۔اسی طرح حکومت کو آج وسیع مقدار میں ادبی جرائد کو خرید کر سکولوں اور کالجوں کی لائبریریز کو مہیا کرنے چاہیے تاکہ طلبا میں ادب کو پڑھنے کا رجحان پیدا ہو۔حکومت کی ترجیحات میں ادب کو فروغ دینا شامل ہونا چاہیے۔اس کے ساتھ ساتھ ادیب اور مدیران رسائل کو اعزازیہ دینے کی روایت بھی قائم کرنی چاہیے تاکہ ادیب کی پذیرائی ہو اور وہ ادب کی تخلیق میں اپنا کردار ٹھیک طرح سے نبھا سکے۔

ج:۔ادبی طبقے کے معاشی مسائل:

پہلے زمانے میں ادب کو صرف دل بہلانے اور وقت گزارنے کا سامان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادب زندگی کا ترجمان بن گیا۔ ادب نے انسانی مسائل کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کی کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان نے محسوس کیا کہ ادب برائے ادب کی بجائے ادب کو زندگی سے جوڑنا چاہیے کیونکہ سائنس کی ترقی نے انسان کو نئے حالات سے روشناس کروایا۔ انسان کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی پیدا ہونے لگی، انسان کے اندر غور و فکر کرنے اور معاشرے میں ترقی کرنے کا رجحان جنم دینے لگا، نئے چیلنج سامنے آنے لگے۔

سائنس کی ترقی نے انسان کے معاشی اور سماجی حالات میں تبدیلیاں رونما کیں تو ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ادب تفریح و طبع سے نکل کر زندگی کی ترجمانی کرنے لگا۔ عام زندگی کے موضوعات ادب کے موضوعات بننے لگے۔ ادیب کو نئے حالات و واقعات سے نبرد آزما ہونے کے لیے خود کو معاشی طور پر خود کو مستحکم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ادیب اور مصنف، ادب کے ذریعے معاش کا وسیلہ بھی بنانے لگے۔ الیکٹرانک میڈیا کی ترقی نے ادبا کے لئے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ ادیب لاکھوں لوگوں کے ساتھ اپنی تخلیقات چند منٹوں میں شیئر کر سکتے ہیں۔ لیکن ادیب ہر دور میں معاشی مشکلات کا شکار نظر آتا ہے۔ جہاں الیکٹرانک میڈیا کی ترقی نے آسانیاں پیدا کیں وہیں نوجوان طبقے میں ادب اور کتاب کی اہمیت کو کم تر کر دیا۔

ادیب نے معاشرے کے مسائل و واقعات کے علاوہ اخلاقی اصول و ضوابط کو بھی ادب میں زیر بحث لانا شروع کر دیا۔ آج کے جدید دور میں ادیب کا وہ مقام نہیں رہا جو پہلے دور کے ادیبوں اور شاعروں کو حاصل تھا لیکن ادیب کی معاشی حیثیت آج کی طرح پہلے سے بھی زیادہ مستحکم نہ تھی۔ ہمارے ادیبوں کا معاشی تقابل انگلش یا بدیشی زبان کے ادیبوں سے کیا جائے تو واضح فرق سامنے آئے گا۔ اسی طرح غالب و میر بھی اپنے دور میں معاشی مسائل کا شکار رہے تھے۔ میر اپنے گھر کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ گھر کی دیواریں بوڑھے کی کمر کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ ساری رات چھت کی کڑیاں کڑکڑاتی رہتی جس کی وجہ سے ہر وقت چھت گرنے کا گمان ہوتا رہتا لیکن وہ اپنی انانیت کے سبب کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے گریز کرتے تھے۔ بھوک برداشت کر لیتے، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے

؎ آگے کسو کے کیوں کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

اسی طرح جوش ملیح آبادی جو ایک اچھے مستقبل کی خاطر ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے آئے، ایک انقلابی شاعر تھے، اقلیم نظم کے بادشاہ تھے۔ کراچی میں ان کو ایک ایک سینما الاٹ کیا گیا لیکن افتادِ طبع کے ہاتھوں انہوں نے سب کچھ گھما دیا۔ زندگی کے آخری دن پنشن پر بمشکل گزارا کیا۔

احمد ندیم قاسمی ایک بڑے ادیب، شاعر، افسانہ نگار، ناقد، صحافی تھے حکومت نے ان کو مجلس ترقی اردو کا انچارج مقرر کیا۔ ان کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ جس سے ان کا گزارا بمشکل ہوتا تھا اور جب سیکرٹری انفارمیشن بنے تو ان کی تنخواہ میں تین گنا اضافہ کیا گیا جو ان کے مقام و مرتبے کی حیثیت سے کم تھی۔

منیر نیازی جو ایک بڑے شاعر تھے ان کے بھی معاشی حالات کبھی اچھے نہیں رہے تھے۔ دوست، احباب ان کا بہت خیال رکھتے تھے، آج کا ادیب بھی معاشی مسائل کا شکار نظر آتا ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے نئی نسل میں کتاب پڑھنے کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ آج کے جدید دور میں کتاب چھپوانے کے لیے اچھے خاصے سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ادیب کو کتاب چھپوانے کے بعد پہلے تحفے کے طور پر سب دوستوں کو پیش کرنا پڑتی ہے تاکہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کر کے فیض یاب ہو ہوں اور اپنی رائے کا اظہار کریں۔

جاوید انور نے اپنے افسانوی مجموعہ ''سرکتے راستے'' کے افسانے ''دروازے'' میں اسی رویہ کی عکاسی کی ہے کہ ایک ادیب جو معاشی مسائل کا شکار ہے ان معاشی مسائل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اپنی کتاب چھپوانے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔

> ''پچیس تیس افسانے بھی چھپواؤں تو اسی ہزار سے ایک لاکھ کا خرچہ بتاتے ہیں اگر درمیانہ سا کاغذ استعمال کریں تو۔ کل بینک سے پتہ کیا تو کھاتے میں کل گیارہ ہزار تین سو باسٹھ روپے پڑے تھے۔''(۱۷)

اس اعتبار سے ایک ادیب کی معاشی حیثیت اجاگر ہوتی ہے کہ ادیب کو کتاب چھپوانے کے لیے ایک بڑی خطیر رقم کی ضرورت پیش ہوتی ہے جو کہ اس کے پاس موجود نہیں ہوتی۔ ادیب معاشی طور پر اتنا مستحکم نہیں ہوتا کہ وہ اپنی تخلیقات کو کتاب کی صورت میں سامنے لائے کیونکہ اس معاشی مسائل کی فکر نے ادیب کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی تخلیقات کسی کو بغیر معاوضے کے پیش کر دیتا ہے کہ آپ چھپوائیں۔ جیسا کہ: ''آپ ہی بتائیں کہ کتاب چھپواؤں تو کیسے؟ آپ میرے افسانے لے لیں چھپوائیں میرا کچھ تقاضا نہیں'' (۱۸)

اس اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آج کے عصری دور میں تخلیق کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ ہر شے پیسے کے ترازو میں تولی جا رہی ہے۔

سائنسی ترقی نے جہاں انسان کے لیے بہت سی سہولیات اور آسائشات پیدا کیں وہیں بہت سے مسائل بھی سامنے آئے۔ الیکٹرونک پرنٹ میڈیا نے اتنی ترقی کرلی کہ دنیا گلوبل ویلج کی شکل اختیار کرلی۔ سوشل نیٹ ورک کے استعمال نے انسان کو صرف اپنے رشتے داروں کے لئے نہیں بلکہ فرد کے پاس اپنی ذات کے لیے ٹائم نکالنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ اسی طرح نوجوان نسل میں کتاب پڑھنے کا وقت بھی نہیں رہا اور نہ ہی کتاب خریدنے کا رواج آج کے اس دور میں رہا ہے کیونکہ آج کل ہر چیز انٹرنیٹ کے ذریعہ حاصل کی جارہی ہوتی ہے۔ جس سے ادیب یا مصنف بہت متاثر ہوا، اس کو اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جیسا کہ: ''لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ساجد صاحب مجھے کیا ملا لکھنے میں وقت ضائع کرتا ہوں چھوٹی موٹی نوکری ہے۔ (۱۹)''

ادیب کو ہر دور میں معاشی مسائل کا سامنا رہا ہے کیونکہ جدید معاشرے کی بڑھتی ہوئی ضروریات ادیب کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ادب کی تخلیق ادیب یا مصنف کو معاشی طور پر مستحکم کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ کیونکہ جدید دور میں ادب سے لگاؤ کمزور ہوتا جارہا ہے۔ ادیب کو معاشرے میں وہ مقام اور مرتبہ نہیں دیا جاتا جو ان کا حق ہے۔ آج کا نوجوان، ادب اور ادیب سے ناواقف ہو چکا ہے۔ ادیب کو اپنی تخلیقات کے عوض بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے جو ان کی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔

> ''خیر صبح نکلتا ہوں تو دور تک پیچھے بچوں اور ان کی ماں کی آوازیں آتی ہیں کتاب نہیں، کاپی نہیں، فیس نہیں، وردی نہیں اور یہاں تک کہ گھی نہیں، شکر نہیں، دال نہیں، دودھ نہیں۔''(۲۰)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادیب کی معاشی حالت اس قدر کمزور ہے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی بھی پوری کرنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح ادیب یا مصنف ان تمام معاشی حالات کے پیش نظر کتاب چھپوانے سے پہلے ہزار بار سوچتے ہیں کیونکہ ان کی معاشی حالت ادب کی تخلیق و اشاعت میں رکاوٹ کا باعث بن رہی ہوتی ہے کیونکہ کتاب آنے سے پہلے ہی پبلیشر ادیب کو اس بات سے آگاہ کردیتے ہیں کہ کتاب کی مارکیٹنگ نہیں ہے، کتاب کو خریدنے والا کوئی نہیں۔ پہلا ایڈیشن کتاب چھپوانے کا دوستوں کو تحفہ کے طور پر بھیج دیا جاتا ہے کیونکہ دوست احباب بھی کتاب خریدنے کی بجائے اپنے دوست احباب ادیب کی کتاب بطور تحفہ لینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔

> ''دوست واقف کار ابھی سے دستخط شدہ کاپی کی فرمائشیں رجسٹر کرا رہے ہیں یعنی کسی کی کتاب خریدنے کی نیت نہیں ہے یہ سرمایہ کاری کدھر سے کروں۔''(۲۱)

آج کا ادیب معاشرے میں خود ترسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ادیب معاشرے میں اس وقت تک

ترقی نہیں کر سکتا ہے جب تک ادب و فن کی ترویج میں حکومت ساتھ نہیں دیتی۔ کتاب کی اشاعت اور ترویج کے لئے رائیلٹی دینا حکومت کا فرض ہے۔ معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنے ادب کی ترقی کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کرتا۔ ادب کی ترقی کیلئے حکومت کا فنڈ مختص کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری ہونا چاہیے تاکہ ادیب معاشرے میں ایک اچھا مقام حاصل کر سکے اور تمام معاشی مسائل سے بے فکر ہو کر اپنی تخلیقات کی اشاعت کو یقینی بنائے۔ جیسا کہ: ''پتہ نہیں کون سے مشہور ترین لوگ ہوگے جن کی کتابیں ناشر مفت چھاپتے ہوں گے۔ رائیلٹی کا تو ملک عزیز میں تصور ہی نہیں۔''(۲۲)

اسی طرح ''دروازے'' افسانے میں ادیب کے معاشی مسائل کو اجاگر کیا۔ ٹی ہاؤس کا مینیجر جو ادیبوں اور مصنفوں کی بیٹھک کو پسند کرتا اور اپنے باقی گاہکوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتا ہے۔ وہ جب افسانے میں موجود ادیب ارشد بھائی کے معاشی مسائل سے آگاہ ہوتا ہے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے اس سے ادھار لے کر کام چلایا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کو ٹھیکہ منسوخ کرنے کا نوٹس مل جاتا ہے جیسا کہ: ''دائیں طرف لال رنگ کی پرانی گھسی ہوی جلد والی نوٹ بک پڑھی تھی جس میں کئی نامور افسانہ نگاروں شعراء اور ادبی محققین کی واجب الادا رقم درج تھی۔''(۲۳)

اس اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ عام آدمی سے زیادہ ادیب اور ادبی محققین قرض دار ہوتے ہیں جن کی جیب میں چائے کی پیالی پینے کے پیسے بھی نہیں ہوتے ہیں۔ ادیب جو معاشرے کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں جگہ دیتا ہے وہ خود معاشی مسائل کا شکار ہو کر خود ترسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ادب کی تخلیق کو ذریعہ معاش اپنا کر ضروریات زندگی پوری کرنی مشکل ہو گیا ہے۔ آج کے ادیب کو اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے دوسرے پیشوں کو اپنانا پڑتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے کتاب پڑھنے اور خریدنے کے رواج کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ ادیب اس وقت تک معاشرے میں بااثر مقام نہیں پا سکتا جب تک حکومت ادب کی ترویج کیلئے فنڈ میں حصہ مقرر نہیں کرتی۔

حوالہ جات

۱۔انور شیخ، چند ہم عصر افسانہ نگار (تجزیاتی جائزے)، عشرت رومانی، جاوداں پبلی کیشنز، کراچی، س۔ن، ص۹۷

۲۔ جاوید انور، سرکتے راستے، عجیب لڑکی، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص۵۷

۳۔ایضاً، ص۵۷

۴۔ جاوید انور، سرکتے راستے، انوکھی لڑکی، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص۵۸

۵۔ جاوید انور، سرکتے راستے،، ص۵۹

۶۔ایضاً، ص۵۸۔۵۹

۷۔ایضاً، ص۵۹

۸۔ایضاً، ص۵۹

۹۔ جاوید انور، سرکتے راستے، افسانہ کوئی پتھر، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص۱۰۷

۱۰۔ایضاً، ص۱۰۷

۱۱۔ایضاً، ص۱۰۸

۱۲۔ جاوید انور، سرکتے راستے، افسانہ دروازہ، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص۳۳

۱۳۔ایضاً، ص۳۵

۱۴۔ایضاً، ص۳۵

۱۵۔ایضاً، ص۳۹

۱۶۔ایضاً، ص۳۷

۱۷۔ایضاً، ص۳۷

۱۸۔ایضاً، ص۳۷

۱۹۔ایضاً، ص۳۳

۲۰۔ایضاً، ص۳۴

۲۱۔ایضاً، ص۳۷

۲۲۔ایضاً، ص۳۷

۲۳۔ایضاً، ص۳۸

باب پنجم

مجموعی جائزہ/نتائج/سفارشات

۱۹۶۰ء کی دہائی میں زندگی تیزی سے بدلنے لگی۔ ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں نے جنوبی ایشیا کے عوام پر گہرے اثرات ڈالے۔ مارشل لاء کا دور، سیاسی کشمکش اور آمریت کے دور نے پاکستانی عوام کی نفسیات کو خاطر خواہ متاثر کیا۔ ان کے اندر قومی و اجتماعی لاشعور میں جبر، غلامی اور پابندی کے نقوش پرورش پانے لگے۔ پاکستان مختلف سیاسی اور مذہبی تحریکوں کی زد میں رہا۔ ان تحریکوں کے زیر اثر جو اثرات معاشرے اور عوام پر مرتب ہوئے، ان تمام کا احوال اردو افسانے میں ملتا ہے۔ اسی طرح سے ڈھاکہ کا مسئلہ ۷۰ء کی دہائی میں سر اٹھاتا ہے، یہ مسئلہ ۷۰ء کی دہائی سے مزید آگے چل کر غیر یقینی صورتحال پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ اس حوالے سے بھی بہت سے افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا اور اپنے عہد کی عکاسی کی ہے۔ اس ضمن میں لکھنے والے افسانہ نگاروں میں رشید امجد، جوگندر پال، اے خیام، انیس رفیق، منیر احمد شیخ، سلطان جمیل اور احمد جاوید وغیرہ شامل ہیں۔

۸۰ء کی دہائی میں پیش آنے والے واقعات میں شہری زندگی کے مسائل بھی ہیں۔ اس دور میں صنعتی ترقی اور سائنسی ایجادات نے جہاں انسان کی زندگی میں سہولیات پیدا کیں، وہیں بہت سے مسائل بھی سامنے آنے لگے۔ ان تمام مسائل کو بھی افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں بیان کیا۔ منشایاد کا ''شب چراغ''، انتظار حسین کا ''گونڈوں کا جنگل'' اور الطاف فاطمہ کا افسانہ ''ننگی مرغیاں'' وغیرہ ہیں۔ اس دہائی میں مارشل لاء، بھٹو کی پھانسی نے عوام اور ادیبوں کو بہت متاثر کیا۔ عوام کے اندر غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ان حالات میں معاشرے کے حساس طبقہ نے ان تمام مسائل اور عوام کے جذبات کو نظم و نثر میں بیان کر کے معاشرے کو استحکام بخشنے کی کوشش کی۔

اسی دور میں اعجاز راہی مزاحمتی ادب کا پہلا مجموعہ ''گواہی'' کے نام سے مرتب کر کے عوام کے سامنے لائے، جو اس عہد کی اصل صورتحال کا بہترین عکاس ہے۔ اس طرح ہر دور میں ادیب اپنے عہد کی عکاسی کا ذمہ اٹھاتا رہا۔ معاشرے اور عوام کے مسائل بیان کرتا ہے۔ ۹۰ء اور اکیسویں صدی میں ادیب نے معاشرے میں موجود سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو بیان کرنے پر فوکس کیا۔ عالمی سطح پر یہ صدی اقتصادی و روحانی بحران، نفسا نفسی اور سیاسی تشدد کی صدی تھی۔ اس دور میں انسان علمی ترقی کے دور سے گزر رہا تھا۔ یہ ایسی صدی تھی جس میں انسان سے زیادہ مشینوں کی عملداری بڑھ رہی تھی۔ اخلاقیات، روحانیات اور مادیت پرستی میں جدلیاتی عمل تھی، ایک طرف مادہ پرستی اور تعقل کا زور تو دوسری طرف روحانیت اور عقل سے کنارہ کشی کا چرچا

عام تھا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کے لئے حیرت زدہ کارنامے انجام دیے لیکن مشینوں کی بے جا عملداری نے انسان کے اندر عدم استحکام کا جذبہ پیدا کیا۔ انسان مشینوں کا غلام بن کے رہ گیا۔ دوسری طرف نئے مواصلاتی رابطوں کی وجہ سے دنیا سمٹ کر عالمی گاؤں بن گئی۔ اسی طرح خالص انسانی روابط کی سطح پر بیگانگی کا عذاب چھا گیا۔ انسان اپنے رشتوں سے اجنبی ھوتا گیا، انسان کے اندر اس قدر اجنبیت نے ڈیرے ڈال دیئے کہ انسان اپنے سامنے موجود انسان کے احساسات اور دکھوں سے بیگانہ ہو گیا۔ اس نے باہر کی دنیا سے تعلق جوڑ لیا، رشتوں اور فرائض کو فراموش کر دیا۔

اسی طرح اقتصادی نظام کو بھی ٹیکنالوجی نے بہت متاثر کیا انسان کی اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا۔ انسان نے خود کو اقتصادی دور میں برتر ثابت کرنے کے لئے میڈیا کا سہارا لے کر اشتہار بازی کو عام کیا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ صارفین سامنے آئیں۔ اس طرح ایک صارفی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ صدی مارکیٹنگ کی صدی تھی۔ صارف کو چیز کے ساتھ ساتھ اس کے اشتہار کی قیمت بھی ادا کرنا پڑتی تھی۔ عوام کا دماغ میڈیا کے دیے گئے تصور کو جلد قبول کرنے لگا۔ اس سے اقتصادی طور پر بہت سے فوائد بھی حاصل ہوئے، اس اشتہار بازی میں نہ صرف چیزوں کی مارکیٹنگ کی گئی بلکہ جمہوریتوں اور افراد کی ذاتی مارکیٹنگ بھی کی گئی۔ اسی اشتہار بازی نے عوام کی سوچنے، فکر کرنے کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا۔ اسی طرح بڑھتی ہوئی مادہ پرستی نے معاشرے سے خانگی رشتوں کی اساس اور شادی بیاہ کے نظام پر کاری ضرب لگائی ہر چیز کی ایک قیمت طے کی جانے لگی۔

اسی صدی میں ترقی کی تیز رفتاری نے کئی گاؤں اور چھوٹے شہروں کو بڑے میگا سٹی میں بدل دیا۔ بڑی بڑی عمارتیں، پلازے، کارخانے، ٹریفک کی ابتری، منشیات کی دستیابی وغیرہ عام ہو گئی۔ ان تمام مسائل کو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں بیان کر کے اس صدی کی عکاسی کی کہ انسان کن کن مسائل میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔ اس دور میں سیاسی و سماجی مسائل کو بیان کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایٹمی دھماکوں سے پیدا ہونے پوالی صورتحال، خودکشی، دھماکے، قدرتی آفات، زلزلہ، سیلاب، جدید ٹیکنالوجی کے زیر اثر پیدا ہونے والے مسائل، مارشل لاء کے اثرات، نائن الیون کے اثرات اور نائن الیون کے اثرات کے نتیجے میں ہونے والی جنگوں کی صورتحال، ان تمام واقعات کو افسانہ نگاروں نے بھرپور انداز میں اپنے افسانوں میں بیان کیا۔

اس طرح ادب معاشرے کا حساس ترجمان بن کر سامنے آیا۔ ادیب نے تمام سیاسی اور سماجی احساسات و جذبات کو ایک قالب میں ڈھال کر بیان کیا۔ اس طرح اردو افسانے نے پاکستان کے سیاسی و سماجی، معاشی حالات

کے موضوعات کو اپنے اندر سمیٹ لیا اور ان تمام حالات و واقعات نے پاکستانی اردو افسانے کو نئے موضوعات عطا کیے۔ نائن الیون کے بعد آنے والے دور نے زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی بہت متاثر کیا۔ اس واقعے کو بین الاقوامی سطح پر بھی ادب میں بیان کیا گیا۔ اس واقعے کے اثرات بہت دیر پا تھے جو موجودہ عہد تک نظر آتے ہیں۔ پاکستان نائن الیون کے بعد جنگ میں گھر گیا۔ ملک میں دہشت گردی کے واقعات رونما ہونے لگے۔ امن و امان کی صورتحال خراب ہو گئی، امن و سکون ایک خواب بن کر رہ گیا۔ ان تمام واقعات کی صورتحال اردو افسانے میں دکھائی گئی۔

لوگوں کے اندر بے چینی بڑھ گئی، مساجد، تعلیمی ادارے، عبادت گاہیں غیر محفوظ ہو گئیں۔ ہر پل خوف ستانے لگ گیا کہ کسی بھی وقت غریب کا ردھماکہ کر کے سب کچھ نیست و نابود کر دے گا۔ انسانی جان کا خون جانوروں سے زیادہ ارزاں ہو گیا، انسانی خون ناقدری کا شکار ہوا، یہ بھی افسانوں میں دکھایا گیا۔ نائن الیون کے بعد امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر دیا، اس کے بعد پاکستان کی مغربی سرحد غیر محفوظ ہو گئی۔ آئے روز خون کی ہولی کھیلی جانے لگی، ڈرون حملوں نے الگ سے پریشان کر کے رکھ دیا۔ ان تمام اقدامات سے سب سے زیادہ عام انسان متاثر ہوا۔ اس طرح عام انسان کے قتل عام نے خوف، مایوسی پیدا کر دی۔ انسان داخلی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا۔ ان تمام حالات و واقعات کی عکاسی افسانہ نگاروں کے ہاں ملتی ہے کیونکہ آج کے افسانہ نگار اپنے اصل صورتحال کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔

جیسے جیسے انسان ۲۱ ویں صدی سے آگے قدم بڑھا رہا ہے وہ زیادہ تیزی سے مادیت پرستی کی طرف جا رہا ہے۔ صنعتی ترقی نے جہاں سرمایہ داری کو ترقی دی، وہیں بہت سے معاشرتی و مذہبی اقدار کو بھی فراموش کر دیا۔ جدید ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے ہر چیز کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ پرانی تہذیب و ثقافت معدوم ہو کر رہ گئی ہے، شہر سے گاؤں تک کے فاصلے سمٹ گئے ہیں، جس سے گاؤں کا قدرتی حسن ماند پڑنے لگا ہے۔ شہروں نے گاؤں کو ساتھ ملا کر فطرت نگاری کو مسخ کر دیا ہے۔ نمود و نمائش نے جگہ بنالی ہے۔ لوگوں کے مابین مقابلے کی فضا جنم لینے لگی ہے۔ ابھی فیشن، جدید لباس، خوبصورت گھر وغیرہ کا دکھاوا عام ہونے لگا ہے۔ انسان تمام آسائشات کا اسیر ہو کر اپنی بنیادی اقدار کو بھولنے لگ گیا ہے۔ غریب، احساس محرومی کا شکار ہونے لگا ہے۔ ایسے میں تیزی سے ختم ہوتی ثقافت اور سادگی کو معاصر افسانہ نگاروں نے موضوع بنایا۔

افسانہ نگاروں نے بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار پر مایوسی کا اظہار کیا۔ اس بدلتی معاصر صورتحال کو جاوید انور

نے بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا کہ اس عہد کا فرد طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہے۔آج کا فرد گلوبل ولیج کا حصہ ہے لیکن اس کی زندگی قدم قدم پر مسائل کا شکار ہے۔مادیت پرستی کی اس دوڑ میں انسان صبح سے شام تک کام کرتا رہتا ہے تاکہ اپنی معاشی ضروریات کو عصری عہد کے تقاضوں کے مطابق پورا کر سکے۔اس کوشش میں انسان اپنے آرام کا وقت بھی کھو دیتا ہے۔بے چینی اور کشمکش کی کیفیات سے دوچار رہتا ہے۔جدید ٹیکنالوجی کی ایجاد ،موبائل اور انٹرنیٹ کی دنیا میں کھوئے ہوئے انسان کی عکاسی کی کہ سوشل میڈیا نے آج کے انسان کو کن مسائل سے دوچار کر دیا ہے۔

موبائل فون نے ہمارے معاشرتی و مقامی اقدار کو ٹھیس پہنچائی ہے،ساتھ مل کر بیٹھنے یا ملاقات کرنے کا رواج ختم کر دیا ہے،لوگوں کے اپنے پاس موجود رشتوں اور لوگوں سے تعلقات معدوم ہوتے چلے جا رہے ہیں،جبکہ باہر کی دنیا سے تعلقات استوار ہو رہے ہیں۔اس بڑی تبدیلی سے خاندانی روایات کو نقصان پہنچا ہے۔آج کا نوجوان اس جدید ایجاد میں اس قدر کھو چکا ہے کہ وہ اپنے اہم مقاصد سے دور ہوتا جا رہا ہے۔موبائل فون کا کثرت سے استعمال فرد کے درمیان دوری پیدا کر رہا ہے۔ایک گھر میں رہنے والے ایک دوسرے سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں،ہر فرد اپنی دنیا میں مصروف ہے،سوشل میڈیا،فیس بک،واٹس ایپ کے بے جا استعمال نے اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔انسان جسمانی طور پر فیملی کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اس کا دل کسی اور دنیا میں ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں نوجوان نسل کو والدین کی باتیں سننے اور سمجھنے کا وقت بھی نہیں ملتا جس کی وجہ سے ہماری نوجوان نسل نفسیاتی مسائل کا شکار ہو رہی ہے۔اس طرح سوشل میڈیا،موبائل فون نے مرد اور عورت کے درمیان فاصلوں کو ختم کر دیا ہے۔مرد،عورت آزادانہ بات چیت کر سکتے ہیں۔اسی طرح شادی بیاہ کے فیصلے جو بڑوں یا خاندان والوں کی رضامندی کے ساتھ طے پاتے تھے وہ اب صرف لڑکی اور لڑکے کی مرضی سے طے ہونے لگے ہیں۔بڑوں کا شادی بیاہ کی رسومات میں شامل ہونا اہم نہیں سمجھا جاتا ہے۔نوجوان نسل اپنے فیصلوں میں خود کو آزاد تصور کرتے ہیں۔اب عورت اور مرد کا ملنا،گھومنا پھرنا عام سی بات سمجھی جانے لگی ہے۔

اردو افسانے میں اس معاصر صورتحال کو بھی افسانہ نگاروں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔اسی طرح جدید سہولیات،سائنسی ترقی نے جہاں منفی اثرات مرتب کیے وہیں بہت سے مثبت نتائج بھی سامنے آئے۔بڑھتی ہوئی سرمایہ داری نے جہاں شہروں کو گاؤں کی طرف پھیلا دیا وہیں گاؤں کی دنیا پر مثبت اثرات بھی مرتب کیے۔گاؤں کا حسن تو متاثر ہوا لیکن وہیں جدید اشیاء کا استعمال اور سہولیات نے دیہی زندگی کو ترقی کی طرف گامزن کر دیا ہے۔جدید مواصلاتی نظام کے تحت گاؤں میں بھی موبائل اور انٹرنیٹ کا استعمال ہونے لگا ہے۔اب دیہات میں

رہنے والا شخص انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا سے رابطہ رکھے ہوئے ہے۔جدید مشینری کے استعمال نے سرمایہ داری نظام کو متعارف کرایا لیکن جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہوا۔ صنعتی ترقی نے انسان کے اندر مادیت پرستی کی جڑیں مضبوط کر دیں ہیں۔

اس مادیت پرستی نے اقدار کو زوال دیا ہے۔معاصر افسانہ نگاروں نے اس موضوع کے بارے میں لکھا کہ آدمی ہوس زر میں اس قدر کھو چکا ہے کہ جہاں جھوٹ، فریب، بدکاری، ہیرا پھیری وغیرہ کوئی برائی محسوس نہیں ہوتی بلکہ پیسے کے حصول میں یہ تمام برائیاں کار آمد حربہ ثابت ہوتی ہیں۔ برق رفتار ٹیکنالوجی نے مثبت اقدار کو کھوکھلا کر دیا ہے۔اسی طرح سیاسی میدان میں بھی بہت سی تبدیلیاں سامنے آئی ہیں۔ادب میں چونکہ انسانی زندگی سے متعلق تمام شعبوں کو جگہ دی جاتی ہے اور چونکہ سیاست بھی معاشرے کے تمام شعبوں میں ایک مقتدر قوت بن گئی ہے اس لیے ادب سمیت زندگی کے تمام شعبوں پر اثر ڈالتی ہے۔

آج کے اس دور میں سیاسی رویوں کو عوام کے سامنے لانا ادیب اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ادیب اپنی تخلیقات میں دکھاتا ہے کہ کس طرح اعلی طبقہ غریب طبقے کا استحصال کرتا ہے۔ان کے حقوق کی پامالی کر کے خود فائدہ اٹھاتا ہے اور کس طرح حکومتی ادارے آپس میں ملی بھگت سے کرپشن کرتے ہیں اور عوام کا استحصال کرتے ہیں۔وہ ادارے جو انسان کی جان ومال کی حفاظت پر مامور ہوتے ہیں، وہ ان اعلیٰ افسران، سیاستدانوں کے غلام بن کر انسانیت کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔عوام کو انصاف فراہم کرنے کی بجائے ان اعلی افسران کے احکام بجالانے کے پابند ہوتے ہیں۔ان تمام مسائل کی عکاسی جاوید انور کے ہاں ملتی ہے۔آپ نے حکومتی انتظامی سطح پر بھی حکمران طبقے کی نااہلی کو اجاگر کیا ہے کہ کس طرح اعلی طبقہ غریب کا استحصال کرتا ہے، ناانصافی پر مبنی معاشرہ نااہل حکومتی انتظامیہ کے زیر اثر پروان چڑھ رہا ہے۔

آپ نے اپنے افسانوں میں معاصر انسانی صورتحال پر تمثیلی انداز اپناتے ہوئے اپنے افسانوں میں طنز کیا ہے کہ کس طرح حکمران طبقہ دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔کس طرح عوام کے حقوق کی حق تلفی کی جارہی ہے۔غریب، غریب سے غریب تر ہوتا جارہا ہے، جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ غریب کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں تاکہ غریب ان کے سامنے اپنے حقوق کی آواز بلند نہ کر سکے، وہ غربت کی لکیر پر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ان تمام مسائل کی عکاسی معاصر افسانے کا حصہ ہے۔

نتائج

جاوید انور دور حاضر کے معاصر افسانہ نگار ہیں۔آپ کی کہانیوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ کا

موضوع محبت اور زمین ہے۔آپ زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو کہانی کے روپ میں ڈھالنے کے فن سے آشنا ہیں۔آپ کے افسانوں میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں لحاظ سے وسعت پائی جاتی ہے۔آپ نے اپنے دونوں افسانوی مجموعہ ''برگد''اور ''سرکتے راستے''میں دکھایا کہ کس طرح عہد حاضر میں بھی طاقتور اپنی طاقت کے نشے میں چور ہو کر غریب کا استحصال کرتا ہے۔جاوید انور نے سماجی، مذہبی، ادبی، سیاسی حوالے سے موجود ناانصافیوں کے خلاف قلم اٹھایا۔آپ نے آج کی معاصر صورتحال کو بیان کیا۔آپ نے عام انسان کی زندگی کے مسائل کو بیان کیا، ان کے کردار، حالات، مشکلات پر بات کی۔جاوید انور نے زندگی کے تجربات کو بنیاد بنا کر معاشرے کی خود فریبیوں، منافقتوں اور اختلافات کو مختلف حوالوں سے جانچا ہے۔

جاوید انور نے سماجی زندگی کی مختلف حقیقتوں کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔آپ نے شہری زندگی کے مسائل مثلاً اقتصادی، طبقاتی مسائل، صنعتکار اور مزدوروں کا تعلق، کارخانوں کا قیام، اس سے پیدا شدہ مسائل، اربنائزیشن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی، اضطراب، شکست وریخت اور اخلاقی گراوٹ وغیرہ جیسے مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔جاوید انور نے انسانی استحصال کے نئے حربوں کی نشاندہی کی ہے کہ ترقی یافتہ دور میں کس طرح غریب کا استحصال کیا جارہا ہے، دنیا گلوبل ویلج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔شہر نے پھیلتے ہوئے گاؤں کی تہذیب وثقافت پر بہت سے اثرات مرتب کیے ہیں۔انسان فطرت نگاری سے دور ہوتا چلا جارہا ہے۔معاشرے میں اخلاقی وخاندانی اقدار سے آج کا نوجوان کنارہ کشی اختیار کرنے کے درپے ہے۔خانگی نظام ختم ہو رہا ہے۔جاوید انور نے جدید ٹیکنالوجی اور آئی ٹی کے انقلاب سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو بھی افسانے کا موضوع بنایا۔آپ نے جدید معاشرے میں مشرقی عورت کے مقام کو بھی واضح کیا جو پڑھ لکھ کر گھریلو فرائض کے ساتھ ساتھ معاشی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھا رہی ہے۔

جاوید انور نے اپنے افسانوں میں سیاسی زندگی کے معاصر سیاسی رویوں کی عکاسی کی ہے۔آپ نے سماج میں موجود طبقاتی نظام کی کشمکش کو بھی اجاگر کیا ہے کہ کس طرح جاگیردارانہ طبقہ عوام کا استحصال کرنے میں مصروفِ عمل ہے۔عوام کو اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرتے اور ان کے حقوق کی پامالی کرتے ہیں۔آپ نے اپنے افسانوں میں سیاست کے عام آدمی کی زندگی پر اثرات کو اجاگر کیا کہ کس طرح حکومتی اور ریاستی ادارے آپس میں مل کر کرپشن میں ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں۔جاوید انور نے تمام اخلاقی وسماجی برائیوں اور ناانصافیوں سے پردہ اٹھایا ہے کہ وہ ادارے جو انسان کی جان ومال کی حفاظت پر معمور ہیں۔ان غیر قانونی کاموں میں ملوث ہوتے ہیں جو انسانیت کے لیے سم قاتل ہیں۔

اسی طرح جاوید انور نے اپنے افسانوں میں ادب اور ادیب کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے دور نے ادیب اور ادیب کو بہت متاثر کیا ہے۔ ادیب جو معاشرے کے مسائل کو اپنی تخلیق میں بیان کر کے عوام کے سامنے لاتا ہے۔ ان کے مسائل کے حل کی فکر کو اجاگر کرتا ہے۔ لیکن آج کے جدید دور میں سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کی یلغار نے قاری کا کتاب سے رشتہ کمزور کر دیا ہے۔ لوگ کتاب خریدنا اور پڑھنا ضروری خیال نہیں کرتے۔ شاعروں والا زمانہ ماضی کی یاد بن چکا ہے۔ ادبی حوالے سے بیٹھک کی روایت ختم ہوتی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے معاشرہ اخلاقی اقدار و روایات سے محروم نظر آتا ہے۔ اس طرح انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور موبائل فون کے انقلاب نے ہماری زندگیوں میں جگہ بنالی ہے۔ ان کے اخلاقی و معاشرتی پہلوؤں نے ہمیں جتنا متاثر کیا ہے ان کے افسانوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

طرز تحریر کے اعتبار سے جاوید انور نے افسانے سادہ بیانئے میں لکھے ہیں، ان میں ایمائیت، ایجاز اور اشاریت سے کام لیا گیا ہے جو کسی بھی افسانہ نگار کی خوبی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کا مزاج موضوعاتی اور حسیاتی سطح پر اپنے معاشرتی مسائل سے جڑا ہوا ہے۔ ان کے افسانوں میں تکنیک کے نئے تجربے جو عالمی فکشن میں ہو رہے ہیں وہ موجود نہیں ہیں لیکن آج کی زندگی سے لبریز ہیں۔

سفارشات

الف۔ زیر نظر تحقیقی مقالے میں جاوید انور کے افسانوں پر معاصر صورتحال کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ان کے افسانوی مجموعے اسلوبیاتی لحاظ سے بھی وسعت اور کشادگی رکھتے ہیں۔اس حوالے سے بھی تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ اردو شاعری میں جاوید انور کے تین شعری مجموعے ''کئی منظر ادھورے ہیں''، ''اگر تم لوٹنا چاہو'' اور ''اے سنو جاگنے والو'' محبت کے جذبات اور سماجی حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ان شعری مجموعوں کو موضوع تحقیق بنا کر سماجی حقائق کے نئے زاویے سامنے لائے جاسکتے ہیں۔

ج۔ جاوید انور نے اپنے شعری مجموعوں میں شاعری کی چاروں اصناف کو بھرتا ہے۔ان کے شعری مجموعوں پر اسلوبیاتی سطح پر تحقیقی کام کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

جاوید انور، برگد، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء

جاوید انور، سرکتے راستے، ماورا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء

ثانوی ماخذ

انتظار حسین، آخری آدمی، کتابیات، لاہور، ۱۹۶۷ء

ابراہیم جلیس، بانگلہ دیش، (افسانہ) مشمولہ الٹی قبر، مکتبہ جلیس، کراچی، ۱۹۷۸ء

اعجاز راہی، گواہی (مرتب) عوامی دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۸ء

انور سجاد، کونپل، مشمولہ استعارے، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۷۹ء

اختر جمال، دوسری ہجرت، مشمولہ زرد پتوں کا بن، التحریر، لاہور، ۱۹۸۱ء

انور سجاد، آج ۴، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء

الطاف فاطمہ، جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، لاہور، ۱۹۸۸ء

انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ، تحقیق و تنقید، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۸ء

اشفاق احمد، سفر مینا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

انتظار حسین، اندھی گلی، مشمولہ شہر افسوس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

انوار احمد، ڈاکٹر، آخرت ایکسپریس، مشمولہ ایک ہی کہانی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء

انتظار حسین، ریزروسیٹ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

ابراہم جلیس، (انٹرویو) مشمولہ ادب اور ادبی مکالمے، از شفیع عقیل، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۲ء

انتظار حسین، اسیر، مشمولہ کچھوے، مشمولہ مجموعہ انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

انور شیخ، چند ہم عصر افسانہ نگار (تجزیاتی جائزے)، عشرت رومانی، جاوداں پبلی کیشنز، کراچی، س۔ن

پروین عاطف، اینڈ آف ٹائم، پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

ثقلین نقوی غلام، سبز پوش، مشمولہ نغمہ و آگ، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۲ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید (مضمون)، مشمولہ ادب اور عصری آگہی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء
حمیرا اشفاق، جدید اردو فکشن، عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء
خدیجہ مستور، ٹھنڈا میٹھا گوشت، مطبوعات، لاہور، ۱۹۸۱ء
خالدہ حسین، ایک بوند لہو کی، مشمولہ پہچان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء
خالدہ حسین، دشمن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء
خورشید عالم، اردو افسانوں میں گاؤں کی عکاسی، نیشنل پبلک ہاؤس، نئی دھلی، ۱۹۹۴ء
خالدہ حسین، آدھی عورت، مشمولہ دروازہ، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
خالدہ حسین، میں یہاں ہوں، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
رشید امجد، الجھاؤ، مشمولہ ست رنگ پرندے کے تعاقب میں، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء
رشید امجد، ڈاکٹر، پت جھڑ میں خود کلامی، اشاعت پبلیکیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء
رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب۔ رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
راجندر سنگھ بیدی، ادب اور سیاست، مشمولہ ادب، زندگی اور سیاست، (مرتبہ) محمد خاور نوازش، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء
راحیلہ بشیر، ڈاکٹر، اردو افسانے میں خیر و شر کا تصور (قیام پاکستان کے بعد) فیصل آباد، مثال پبلیشرز، ۲۰۱۵ء
رشید امجد، شناسائی، دیوار اور تابوت، مشمولہ عام آدمی کے خواب، س۔ن
سید نذیر نیازی، سیاسیات ارسطو، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء
سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۶۹ء
سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ماحول اور مزاج، مشمولہ ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری، ۱۹۸۶ء
سراج منیر، انور سجاد، ایک گفتگو، مشمولہ کہانی کے پانچ رنگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید افسانہ نگاری کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء
سہیل احمد خان، ڈاکٹر، تہذیبوں اور زمانوں میں افسانہ نگار کا سفر، مشمولہ راوی، ۲۰۰۹ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، نگاہ اور نقطے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء
سجاد حیدر یلدرم، اگر میں صحرا نشیں ہوتا، مشمولہ خیالستان، مکتبہ جامعہ، دھلی، ۱۹۳۷
شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
شان الحق حقی (مرتبہ) فرہنگ تلفظ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء

صبا اکرم، جدید افسانہ، چند صورتیں، زین پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۱ء
علی حسنین نقوی، سید، ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
غلام محمد، اداسی، مشمولہ انگلیاں ریشم کی، نثری دائرہ پاکستان، کراچی، ۱۹۹۱ء
فضیل جعفری، ادب میں عصریت کا مفہوم، مشمولہ ذہن جدید، سہ ماہی مارچ، اپریل، مئی ۱۹۹۱ء
فہیم اعظمی، ڈاکٹر، آراء، مکتبہ صریر، کراچی، ۱۹۹۲ء
فوزیہ اسلم، ڈاکٹر اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
قاضی جاوید، وجودیت، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۷ء
گوپی چند نارنگ، فکشن شعریات تشکیل و تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء
مسعود مفتی، باغی، مشمولہ ریزے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۴۷ء
مسعود مفتی، نیند، مشمولہ ریزے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۷۴ء
مسعود مفتی، سپاہی، مشمولہ رنگ سنگ، اقرا اسلام آباد، ۱۹۷۸ء
مسعود اشعر، اپنی اپنی سچائیاں، مشمولہ سارے فسانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء
ممتاز مفتی، روغنی پتلے، مشمولہ مفتیانے، فیروز سنز، لاہور ۱۹۸۹ء
مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
منشایاد محمد، دنیا کا آخری بھوکا آدمی، مشمولہ وقت سمندر، گورا پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۵ء
مرزا حامد بیگ، افسانہ کا منظر نامہ، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء
مبین مرزا، خواب یار انسان، مشمولہ خوف کے آسمان تلے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء
منشایاد، ایک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
منشایاد محمد، ایک کنکر ٹھہرے پانی میں، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء
مبارک علی، تاریخ اور عورت، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء
نجیبہ عارف، (مرتبہ) ۱۱/۹ اور پاکستانی اردو افسانہ (انتخاب و تجزیہ)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء
وارث علوی، تیسرے درجے کا مسافر، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء
وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳ء

Quincy wright, The Study of International Relation NewYork, 1995
The New Encylopedia Britannica, Vol 16,2003
Lewis Numford, The Culture Of Cities, Harcovil Brace And Company, NewYork, 1938
wesber's new illustrated dictionary, Allans Frederic Kullenreinst books INC, publishers New York Washington, D.C, 1970
William Raymond, key words, pg 46,47

اخبارات، رسائل و جرائد

آغا سہیل، پرچم، مشمولہ ماہنامہ فنون، دسمبر، لاہور، ۱۹۷۰ء
ام عمارہ، بہ گناہی بے گناہی، مشمولہ نقش، ماہنامہ کراچی، شمارہ ۶، ۵
الطاف فاطمہ، مسزین ہیروز سکول (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، ۲۰۱۳ء
انور زاہدی، زحال مست (افسانہ)، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۸، ۲۰۱۳ء
انور سدید، ڈاکٹر، ادب عصری آگہی اور انشائیہ، مشمولہ ادبی زاویے، کل پاکستان اہلم قلم کانفرنس ۱۹۸۳ کے مقالات کا مجموعہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
انور زاہدی، پرانے کاغذوں میں افسانہ، سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، ۲۰۱۵ء
حامد سراج، کالی دیواریں (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء
خالد فتح محمد، دل کو دل سے راہ (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۵، ۲۰۱۵ء
خالد فتح محمد، اور طرح کی جنگ، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
رشید امجد، ڈاکٹر، اردو افسانے میں عصری آگہی، مشمولہ تخلیقی ادب، نمل، اسلام آباد
رشید مصباح، خاک زادے (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۷، ۲۰۱۵ء
شہزاد منظر، ادب میں انتہا پسند رجحانات، مشمولہ ماہ نامہ فنون، مدیر احمد ندیم قاسمی، لاہور، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۱ء
شہزاد منظر، یوٹوپیا، سیپ ماہنامہ، کراچی، شمارہ نمبر ۲۴
عابد میر، کتاب چور کی کہانی (افسانہ) مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۹۸، ۲۰۱۳ء
عمارہ طارق، ڈاکٹر، اردو افسانے میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہر، ماہنامہ فانوس، لاہور، جلد ۵۶،

شمارہ نمبر ا، جنوری ۲۰۱۶ء

فرخ ندیم، کچھ لکھنے سے پہلے، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۰، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء

مرزا مبین، ہم عصر اردو افسانہ، مشمولہ مکالمہ ۲۰۰۸ تا ۲۰۰۹، اکادمی بازیافت، کراچی

محمد الیاس، خاندانی لوگ، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات،، شمارہ ۱۰۹، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء

نذیر تبسم، ڈاکٹر، عالمگیریت اور جدید ادبی رجحانات (مضمون)، مطبوعہ ششماہی خیابان

نور ہدیٰ، پرانے کاغذوں میں (افسانہ)، مطبوعہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ ۱۰۲، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۴

انٹرویو

جاوید انور، نجی گفتگو، ریلوے ہیڈ کوارٹر، لاہور، ۲۴ اپریل ۲۰۱۸ء

انٹرنیٹ

Patrica and Hundly, The Importance of Globalization in higher Education. www.intecheon.com